

نفسا نے

قدرت اللہ شہاب



ترتیب

5	لے دے
11	غریب خانہ
22	شلوار
29	جگ جگ
37	کئی ہے رات تو----
46	سب کا مالک
59	اما
65	جال
73	آیا
80	تلاش
90	دو رنگا
99	جلترنگ
106	ڈاگی
113	تین تارے
119	پہلی تنخواہ
126	صنم پلکیت
133	شینو گرافر

(اسی کو دباچہ سمجھ لیجئے!)

لے دے

لینے دینے کے بیوپار میں یا تو بنیئے کو مہارت ہے یا ملا اور پنڈت کو دونوں کے خون میں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کی رمت ہے، اگرچہ ان کا لینے والا ہاتھ ان کے دینے والے ہاتھ سے عموماً درازی مائل ہوتا ہے۔ لیکن یہ جو ایک معلق قسم کی لے دے انسانی سرشت میں گویا ازل سے موجزن ہے، اسے نہ لینے سے سروکار ہے نہ دینے سے البتہ تُو تُو میں والی گردان میں جتنی با محاورہ نگفتیاں نکل سکتی ہیں، وہ بے شک اسی ایک جذبے کی محتاج ہیں۔

غالباً ہماری پہلی لے دے کا آغاز اس وقت ہوا جب اماں خوا اور باوا آدم بیک بنی و دو گوش جنت کے باغیچوں سے گول کئے گئے۔ میاں ابلیس کے ہونٹوں پر ضرور مسکراہٹ پھیل گئی ہوگی، جب اس کے ٹھکرائے ہوئے خاکی مسجود کی زبان پہلی بار لذتِ ممنوعہ سے آشنا ہوئی۔ اس کے بعد گر جا گھر کی زبان میں، جب آسمانی رحمتوں کے دروازے دوبارہ کھل گئے، اور باوا آرم کے بیٹوں اور اماں خوا کی بیٹیوں نے جوق در جوق اس دنیائے فانی کو نوازنا شروع کیا، تو گویا طوفانِ نوح کے نام ضرورت ہے، کا پہلا اشتہار تیار ہونے لگا۔ اب تو اللہ دے اور بندہ لے۔ یا تخت یا تختہ۔ سر سے کفن باندھ کر۔۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ قسم کی نازک خیالیاں عملی جامہ پانے لگیں۔ زن، زر، زمین کی آغوش میں جو روائتی لے دے کا چرچا ہے، اس نے ابال کھا کر ایک طرف تو ملک گیری کی

-----ری

”تو چلی جا غریب خانے۔“ ہری بلبھ گماشتہ نے جھکی ہوئی مونچھوں کے بال منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سک سک کر کسے دکھا رہی ہے

ڈاکٹر نے بھی ٹیسٹ کیا۔ ”فٹ ہے!“ دونوں مسکرائے۔ اور جب کامنی نے غریب خانے میں قدم رکھا تو اس کی دائیں پسلیوں میں ڈاکٹر کے انگوٹھے کے دباؤ سے ابھی تک درد ہو رہا تھا۔ پہلے اس کا جی چاہا کہ بھاگ جائے۔ لیکن پھر اس کی نظر بیٹا پر پڑی، جو مٹی کا ایک گندہ سا پیالہ اٹھائے اس کی طرف بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔۔۔۔۔ ”تم آگئی ہو، کامنی؟“ بیٹا کے منہ پر خوشی کا جوار بھانا سا آیا کیونکہ چار مہینے پہلے وہ بھی اسی طرح آئی تھی۔ لیکن اس کے پاس پرچی تھی۔ جو سوشل ٹھاکر نے دی تھی۔ بیٹا کے ہاتھ میں بھی ہری بلبھ گماشتہ نے سہارے کی ایک ڈور لا کر دے دی تھی۔ لیکن وہ ایک سیدھی سی لڑکی تھی۔ بے حس نہیں۔ ایک سیدھی سی عام سی لڑکی جس کے شعوری احساسات پیٹ کی ٹکر کھا کر چور ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ اور جب سہارے کی ڈور اسے کھینچتی ہوئی مجاز کے پردوں کے پیچھے لے گئی۔ تو بچاری کو کچھ بھی عجیب نظر نہ آیا۔ کیونکہ اس کے دماغ میں سوشل ٹھاکر نے کبھی دیوتا کا روپ نہیں لیا تھا۔ ”تُو نے سوشل ٹھاکر سے پرچی نہ مانگی، کامنی؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ تو جھٹ سے دے دیتے۔ آؤ! ادھر ہمارے پاس بیٹھو۔“

کامنی کا۔۔۔۔۔ بٹھا جا رہا تھا۔ اُسے معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے گردن مروڑ کر اُسے ایک اندھیرے غار میں دھکیل دیا ہے، جس میں بھیانک بھیانک، ڈراؤنی ڈراؤنی روہیں ایک دوسرے پر چڑھی بیٹھی ہیں۔ غریب خانے میں چار سو پچاس روہیں تھیں۔ ٹیڑھی ٹیڑھی ٹانگوں والے ہڈیوں کے ڈھانچے۔ سکتے ہوئے آدمی۔۔۔۔۔ سُکھی ہوئی لٹکتی ہوئی چھاتیوں والی، رینگنے والی بوڑھی عورتیں جن کے بال ان کی ہڈیوں کی طرح سوکھ کر جھڑ گئے تھے۔۔۔۔۔ بیشمار چھوٹے چھوٹے بچے جن کے پیٹ پھولے ہوئے تھے اور ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں، ان کے دلوں میں ایک نامعلوم ارتعاش تھا۔ ایک چھپی ہوئی کپکپاہٹ جو ڈراؤنا خواب دیکھ کر رگ رگ میں لرزے لگتی ہے۔ لیکن زبان پر نہیں آتی۔۔۔۔۔ ان کی معصوم آنکھوں میں ایک اچنتی ہوئی سی وحشت

تھی۔ سہمی ہوئی سی ویرانیاں جو ان کی زندگی کے راستے میں خون آشام بھیڑیوں کی طرح دانت نکالے کھڑی تھیں۔ بچوں کو دیکھ کر کامنی کا دل تڑپ اٹھا، اور اس کا جی چاہا کہ وہ ان تمام معصوم مجسموں کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لے، اور بھیج بھیج کر کہے۔۔۔۔۔ میری جان، تم کائنات کی ویرانیوں میں اڑتے ہوئے آوارہ ذرے ہو۔ جن کو نہ زمین نگلتی ہے نہ آسمان سنبھالتا ہے۔ تم آکر میرے سینے سے چمٹ جاؤ۔۔۔۔۔

ان کے علاوہ پورے ہوس میں آٹھ دس جوان عورتیں تھیں۔ جن کے کپڑے ذرا صاف تھے، چروں پر رونق، آنکھوں میں چمک۔۔۔۔۔ جیسے اجڑے ہوئے قبرستان میں کلیوں کے بوٹے اُگے ہوئے ہوں! ان میں بیٹا تھی، مالو، بستنی، رحمن، فروزاں، شامولی۔۔۔۔۔ اور ایسی ہی بدنصیب جوانیاں جن کا اُجڑا ہوا حُسن ان چڑھاوے کے پھولوں کی طرح تھا جو قبر کے سرہانے پڑے پڑے مرجھا گئے ہوں۔۔۔۔۔ شاید اس چار دیواری میں آنے سے پہلے ہی ان کے سنبھالے ہوئے آگینے چھلک چکے تھے۔ شاید وہ کسی ازل انصاف کے ترازو میں تل چکی تھیں۔ اور قدرت کے کسی درندہ قانون نے ان کے جسم کو چار چھانک چاول کی قیمت پر چکا دیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن جب وہ غریب خانہ میں داخل ہو گئیں، تو گویا ان کی زندگی کے چور دروازے اپنے آپ کھل گئے۔ اور اب ان راستوں سے نئی نئی دھوتیاں، خوشبودار صابن کی نکلیاں، سکتے ہوئے، رینگتے ہوئے انسانی ڈھانچوں کے حصوں سے چرائے ہوئے گلو کوس ڈی کے ڈبے، وٹامن بی کے قرص، کاڈلور آئل، سہمے ہوئے بچوں کے منہ سے چیخنی ہوئی دال، کبھی دودھ، کبھی سپرنٹنڈنٹ کے دفتر کی چائے، کبھی ڈاکٹر کی الماریوں کے پیچھے رکھے ہوئے مصری کے کوزے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کھلے ہوئے دروازوں سے یہ چھوٹی چھوٹی عشرتیں ان کی زندگی میں داخل ہو رہی تھیں۔۔۔۔۔ اور چھوٹے چھوٹے رومان بھی! جو رات کی تاریکی میں غریب خانے کی فضا پر زبردستی چھا جانے کی کوشش کرتے۔ جس طرح قبرستان کے احاطے میں دلہا دلہن کی برات

کھڑی ہو کر باجہ بجانے لگے۔۔۔۔ اور شاید یہی وجہ تھی، کہ رات کے وقت جب سکتے ہوئے کراہتے ہوئے، ڈھانچے زندگی کے لق و دق صحرا میں آخری کنارے کا کھوج لگانے کے لئے تڑپنے لگتے، اور جب ننھے ننھے بچے خواب میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی جھنجھناتی ہوئی کھوپڑیاں دیکھ کر چیخ چیخ اُٹھتے، تو اس وقت یکایک سپرنٹنڈنٹ صاحب کو اپنے ادھورے رجسٹر کا فارم پُر کرنا یاد آتا۔ اور وہ بیٹا کو اپنے دفتر میں بلا لیتے۔ ڈاکٹر کو گلوکوس کے ڈبے اور کونین کی شیشیاں الماری میں سجانے کے لئے فروزاں کی فوری ضرورت محسوس ہوتی۔ گلزار حسین سقے کے مشکیزے میں سرشام ہی چھید ہو جاتے اور ہسنتی کو ٹانگے لگانے کے لئے جانا ہی ہوتا۔ مالو اپنا آنچل سنبھال کر بھوپن باورچی کے برتن منبھوانے جاتی۔ سکھو مہتر کا ٹوٹا ہوا جھاڑو رحمن کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔ اور شامولی کو غریب خانے کی حفاظت اتنی پیاری ہوتی کہ وہ ادھی ادھی رات گئے گیٹ کیپر کو ہشیار کرنے جایا کرتی۔۔۔۔ اور اسی طرح غریب خانے کی بہت سی بیٹاؤں، ہسنتیوں اور شامولیوں نے اپنے اپنے سہارے کی لڑیاں تھام رکھی تھیں۔ اور ان کی زندگی کے چور دروازوں سے اُبلتی ہوئی دال اور چاول کے ساتھ ساتھ نئی نئی دھوتیاں، صابن کی ٹکلیاں، اور گلوکوس، ڈی، کی مٹھاس بھی رس رس کر آنے لگی تھی!

”کیا سوچتی ہو، کامنی؟“ بینا نے اسے ہلا کر کہا۔ ”بابو پوچھتے ہیں رجسٹر میں نام لکھوا دیا تو نے؟“

کامنی چونکی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب عینک ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ ”کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرائے۔ ”داخلہ پھر ہو جائے گا۔ بچاری بھوکی ہے۔ لیجاؤ لنگر میں بیٹا۔ ٹائم ہو گیا ہے۔“

گلزار حسین سقے نے مسکرا کر ایک مٹی کی تھالی اور پیالہ اُسے دیا۔ کامنی کو لنگر میں جاتے ہی ایک دھکا لگا۔ ایک مدھم سے چراغ کی روشنی میں غریب خانے کی ساری آبادی مٹی کے پیالوں اور تھالیوں پر جھکی ہوئی پڑ پڑ کھا

رہی تھی، بچوں کے غول آپس میں لڑ رہے تھے۔ اور نیم جان ہڈیوں کے ڈھانچے کسی برقی قوت سے بیدار ہو کر چیلوں کی طرح بھوپن باورچی پر جھپٹ رہے تھے۔

”ادھر آ جاؤ، اس طرف۔“ بھوپن باورچی نے سر اٹھا کر کامنی کو آواز دی۔ اور اپنے کندھے کا رومال اُتار کر پاس والی جگہ جھاڑنے لگا۔

کامنی چلتے ہوئے لرزتی تھی، اس کے بدن میں چھوٹے چھوٹے سانپ سے ریگ رہے تھے۔ کبھی کسی بڑھیا کی سوکھی ہوئی چھاتی اس کے ہاتھوں سے چھو جاتی، اور کبھی کوئی ہانپتا ہوا بوڑھا بے تحاشا اُس کے کندھوں پر گر کے دم سیدھا کرنے لگتا۔ اور پھر اچانک اُس کے پاؤں پر جیسے اُبلتا ہوا پانی گر پڑا ہو۔ اور ایک خوفناک سی بڑھیا نے اس کی ٹاک پکڑ کر منہ پر زور سے چاٹنا مارا۔ اندھی ہے راند؟ ”بڑھیا کڑکی۔“ ”دال گرا دی باپ کی کتیا نے۔۔۔۔۔۔“ اور جب تک کامنی بھوپن باورچی کے پاس نہ جا بیٹھی۔ وہ بڑھیا غضبناک آنکھوں سے اس کا پیچھا کرتی رہی۔

بھوپن نے اُسے بہت سے چاول دیئے بہت سی دال، اور جب وہ کھا چکی تو اس نے ٹوکڑے کے نیچے سے دودھ کا پیالہ بڑھایا۔ اور کہا ”اپنے ساتھ لے جاؤ۔ چپکے چپکے پی لینا۔“ اور پھر گلوکوس ڈی کی ایک مٹھی بھی کانڈ میں لپیٹ کر کامنی کو دی۔ ”یہ شکریہ ہے۔“ بھوپن نے ہونٹوں سے چُٹ چُٹ کرتے ہوئے کہا ”ولانتی ہے ولانتی!“ اور اپنا ہاتھ پونچھنے کے لئے کامنی کی پیٹھ پر رگڑنے لگا۔

”اری ادھر سے جا۔“ بینا نے کامنی کو دھکیل کر کہا۔ ”کسی نے دیکھ لیا تو شور مچ جائے گا۔ یہ کلموئے کسی کو کھاتے ہوئے دیکھ کر سہارتے نہیں۔“ بینا نے پڑ پڑ کرتی ہوئی آبادی کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن کامنی کے نکلنے سے پہلے ہی بچوں کے ایک غول بیابانی نے اسے گھیر لیا، اور۔ ”دودھ۔ دودھ“ کے ہلے کے ساتھ اس کی ٹانگوں، باہوں، کمر

شلوار

”شلوار؟“ رشیدہ نے میز پر مگمار کے کہا۔ ”کبھی دیکھا بھی ہے تم نے کسی کو شلوار پہنے؟ نہ سمجھ، نہ بوجھ بس ہلادی بالشت بھر کی زبان، اور لگے افلاطون کے کان کاٹنے۔۔۔۔۔۔“

نسیم بے توجہی سے مسکرایا۔ اس نے سگرٹ کا دھواں گھما گھما کر منہ سے نکالا۔ ”وہ دیکھو بھابی، میں نے کیا اچھے رنگ بنائے ہیں!“

”اُلو۔“ رشیدہ غصے سے بولی۔ ”میں شلوار کی بات کرتی ہوں اور تم رنگ بنانا کر۔۔۔۔۔۔“

”اچھا، بابا، اچھا۔ بتاؤ کیا کریں شلوار کو؟“

”اپنے سر سے باندھ کر ناچو، اور کیا؟ بد تمیز کہیں کے۔ جو منہ میں آیا بک دیتے ہو۔ نہ موقع نہ لحاظ، نہ شرم۔ اگر وہ برامان جائے تو؟“

”خدا کی قسم!“ نسیم شرارت سے مسکرایا۔ ”بڑا مزا آئے! میں نے اسی کو ستانے کے لئے تو کہا تھا، بھابی!“

”بس یہی کرتب سیکھنا تم۔ جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہو توں توں عقل گھٹتی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔“

اور پھر یکایک نسیم کو خیال آیا، کہ شاید جمیلہ نے سچ مچ برامان لیا ہو! آہا ضرور چڑ گئی ہوگی! اسی لئے تو وہ سر جھکائے سن سے باہر نکل گئی۔ اس کے گال ضرور لال ہو گئے ہوں گے، اور اس کے کانوں کے پیچھے نادم سی گرماہٹ پھیلی

ہوگی۔ جیسی تو وہ سرسراتی ہوئی نکل بھاگی۔ ورنہ وہ اسے دیکھ کر ٹھہرتی، مکتی، جھکتی، جاتے ہوئے قدم قدم پر گھومتی اور جیسے بچاری کو یک لخت ساری بھولی ہوئی باتیں یاد آگئی ہوں۔۔۔۔۔۔ ”بھابی میری اُون ضرور بھیجنا۔“ ”ہاں بھابی دیکھیو، ہلکے عنابی رنگ کی ہو۔۔۔۔۔۔“ اوئی اللہ، بھابھی نے اپنی نئی چوڑیاں تو دکھائی ہی نہیں۔۔۔۔۔۔ ”کبھی چوڑیاں دیکھنے کبھی سلائییاں اٹھانے، کبھی جھوٹ موٹ کی باتیں دہرانے وہ جاتی، لوٹتی، گھومتی اور نہ جانے کیوں ایک میٹھا سے ارتعاش اس کے سینے میں کپکپانے لگتا، اس کے گالوں پر ہلکی ہلکی سی تھمتھاہٹ دہک اُٹھتی اور اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔۔ یا اللہ، اس کی بھیگی بھیگی نظریں کس طرح صابن کے رنگ برنگ بلبلوں کی طرح ہوا میں تیرتیں۔۔۔۔۔۔ اور نسیم کو یوں محسوس ہوتا کہ اس کا خون سگرٹ کے دھوئیں کی طرح رنگ بناتا ہوا اہل رہا ہے، اور وہ چور چور سی آنکھیں اس کا ایکسرے کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔

”جیلہ ضرور چڑ گئی ہوگی! شبنم کی طرح حساس تو ہی۔۔۔۔۔۔ بھلا چڑتی کیوں نہ؟“ نسیم نے بھابھی کو جھنجھوڑا۔ ”میں کہتا ہوں بھابھی، اس نے بڑا تو مانا ہوگا!“

”چل بھٹیاریہ۔“ بھابی نے میز پر سے چائے کی پیالیاں اکٹھی کرتے ہوئے کہا۔ ”شرم تو نہیں آئی ہوگی، ابھی؟“

”شرم؟ ارے واہ!“ بھابھی کی جھنجھلاہٹ پر نسیم ہنسنے لگا۔۔۔۔۔۔ اور ہنستا گیا یہ اس کی عادت تھی۔ جب وہ ہنستا تو ہنسنے ہی جاتا۔۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔۔

ہی ہی ہی سفید سفید دانتوں کی بتیسی ہے کہ نکلتی آرہی ہے، دونوں رخساروں پر یہ یہ گہرے گول گول گڑھے چل اُٹھتے، اور جب تک بھابی جھپاک سے نچکھے کی ڈنڈی اس کے حلق تک نہ لے جاتی، وہ بند نہ ہوتا۔ جیلہ پر تو نظر پڑتے ہی اس کا دل گد گد آنے لگتا، اور وہ زور زور سے چلاتا۔ ”بھابی، بھابی، لانا ڈنڈی! یہ پڑا دورہ۔۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔۔“

نہ جانے کیوں، بھابی کو دورے کے نام سے وحشت تھی۔ سنتے ہی بلبلا

اٹھتی ”اللہ نہ کرے کسی کو دورہ پڑے۔ میری توبہ، نسیم تیرے منہ میں لگام بھی تو نہیں۔“ نسیم کھل کھل کر مچلتا رہتا۔ جمیلہ بیٹھے بیٹھے سڑتی سی جاتی اس کا رنگ خواہ مخواہ قرمزی سا ہونے لگتا، اور نسیم کا جی تلملاتا کہ وہ اس گداری سی گٹھڑی کو ربڑ کی گیند کی طرح دبا کر پچکا دے! گیند؟ ارے معاذ اللہ۔۔۔۔۔ جمیلہ کا چھریا بدن شہوت کی ٹہنیوں کی طرح جھومتی ہوئی نازک بانہیں، لمبی لمبی ناچتی ہوئی سی ٹانگیں، چھم چھم تھرکنے والے سڈول پاؤں۔۔۔۔۔ جس دن وہ چوڑے چوڑے پانچوں والی کاسنی شلوار، نیلے مورا کین کا پھولدار پھنسا پھنسا کرتے، اور گلابی ریشم کا سرسراتا ہوا دوپٹہ پہن آتی، تو نسیم کی آنکھیں چکا چوندا ہو جاتیں اور وہ جھپ جھپ پلکیں مار کر دروازے کے پردوں کے پیچھے کھسکتا جاتا۔۔۔۔۔ ”اؤ میری پھلجھڑی!“ بھابی ہنس کر کہا کرتی۔۔۔۔۔ ”اونہوں۔“ جمیلہ گلابی ہونٹ بٹورتی۔ ”پہلے شہرات تو آنے دو، بھابی!“ نسیم پردوں کو بانہوں پر لپیٹ کر گھومتا، اور انجان بن کر زور زور سے پوچھتا۔۔۔۔۔ ”شہرات آگئی، بھابی؟ اور حلوا؟“

”شہرات بھی آئے گی، بھیتا۔ ابھی تو پھلجھڑی آئی ہے!“ بھابی شرارت سے کہتی۔ جمیلہ شرما کر اپنا سر بھابی کی گود میں چھپا دیتی۔

نسیم خواہ مخواہ انجان بنتا۔ ”آہا، بھابی۔ پھلجھڑی کیا، ہم تو اتار لیں گے، اتار۔۔۔۔۔ چم چم کرتے ہوئے انگارہ سے اتار! پٹانے۔۔۔۔۔ گلابی گلابی، کاسنی کاسنی، نیلے نیلے کانغدوں میں لپٹے ہوئے پٹانے۔۔۔۔۔ جو دل کی دنیا ہلا کر رکھ دیں۔۔۔۔۔ اور پھر بھابی کی ناک کی طرح تیز تیز نکیلی چھپھوندیں۔۔۔۔۔“

بھابی زور زور سے ہنستی اور اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک اور دوسرا پٹھے کی ڈنڈی پر جا پڑتا! جمیلہ سڑتی سڑتی بھابی کی گود میں دھنستی جاتی، دھنستی جاتی، اور پھر بھابی اس قوس قزح کے ٹکڑے کو دھکیل کر پیڑھی پر بٹھا دیتی۔ ”اب ہٹ بھی جمیلہ پاگل کہیں کی!“

نسیم جھک کر بھابی کے سامنے رکھی ہوئی ٹوکری میں سے مٹروں کی

پھلیاں اٹھاتے ہوئے چوری چوری جمیلہ کی طرف دیکھتا۔۔۔۔۔ دیکھا بھابی میں نہ کہتا تھا، وہ گلابی جار جٹ نہ لو۔۔۔۔۔ رنگ کچا ہے!“

”اے ہے، کچا نہ کچا۔“ بھابی اپنے گلابی جار جٹ کی قمیض پر دونوں ہاتھ پھیرتی ”چار دھو دھل چکی ہے، لیکن ویسی کی ویسی تو پڑی ہے۔۔۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں، جی دیکھ لو، کچا ہے، جمیلہ کے منہ پر کتنا لگ گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔“

ہی ہی ہی۔۔۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔۔۔ ”وہ پھول سے دانت کھلتے، قمقموں کی آندھی سے چلتی، بھابی کے پٹھے کی ڈنڈی ہوا میں بلند ہوتی۔۔۔۔۔ اور جمیلہ اپنے تہمتاتے ہوئے بھبھوکا سے گالوں کو کہنیوں میں چھپائے بھاگتی، جاتی، پھر رکتی، جھجکتی، لوٹتی، گھومتی۔۔۔۔۔ اور اس کو بہت سی بھولی ہوئی باتیں یاد آ جاتیں، اپنی اُون، بھابی کی چوڑیاں۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر وہ ڈیوڑھی پر لگی ہوئی موٹی سی جتن اٹھا کر چلی جاتی، جیسے آسمان کی رنگیلی پینگلیں شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو جائیں!

نسیم کے دل میں طرح طرح کے ہوائی قلعے بنا کرتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا، کہ جمیلہ ریشم کے پتلے پتلے دھاگوں میں بندھی ہوئی پتنگ کی طرح آسمانوں میں اڑتی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ اُونچی اُونچی، ستاروں کے جھرمٹ پھاندتی ہوئی۔۔۔۔۔ اور پھر وہ چاند کی پیشانی پر ایک سترنگے قشقے کی طرح جا بیٹھی۔۔۔۔۔!! یا، جب وہ کمکشاں کی دودھیلی کیاریوں کو دیکھتا، تو اس کے دل میں بے باک سی، باغیانہ سی جھلکیاں آنے لگتیں۔۔۔۔۔ جیسے جمیلہ کی کاسنی شلوار اور نیلی قمیض نے کمکشاں کے ایک بکھرے ہوئے آوارہ سے ٹکڑے کو اپنے دامن میں چھپا رکھا ہو! بادلوں والی رات اُسے ایک بھیانک اور منحوس سا خواب نظر آتی۔۔۔۔۔ وہ جھنجھلا کر اپنے انگلیاں چبانے لگتا، کہ اس کا بس پتہ تو وہ بادلوں کی چادر کو نوچ کر تار تار کر ڈالے جس نے کمکشاں کی لطیف سلونوں پر گھنے گھنے سائے ڈال رکھے ہیں۔۔۔۔۔ اور نہ جانے کیوں اُسے جمیلہ کی کاسنی شلوار اور نیلے مورا کین کی قمیض پر غصہ آنے لگتا۔۔۔۔۔ اور وہ دالان میں کھڑا ہو کر

چاہتا کہ بھابی بچھے کی ڈنڈی زور سے اس کے حلق میں مار دے۔۔۔۔۔

ایک روز وہ مچھلی کے شکار کو گیا۔ ندی کانٹوں پانی ہلکی ہلکی لہروں میں چھلک رہا تھا۔۔۔۔۔ چھوٹی چھوٹی، ابھی ہوئی سی لہر۔۔۔۔۔ سفید گلاب کا ایک بڑا سا پھول ان کے بہاؤ میں تیز تیز جا رہا تھا۔۔۔۔۔ ڈگمگاتا ہوا، تھرتھاتا ہوا، کبھی وہ مچلتی ہوئی لہروں کے زیر و بم میں ڈوبتا، کبھی اچھلتا، پھر ڈوبتا، پھر اچھلتا۔۔۔۔۔ اور نسیم کا جی بے اختیار اُکسا کہ وہ دھم سے پانی میں کود پڑے، اور اس تیز رفتار پھول کو جھپٹ کر روک لے۔۔۔۔۔ جو جیلہ کی گول گول، سفید ایڑی کی طرح بھاگتا ہوا، جا رہا تھا۔۔۔۔۔ ہائے جیلہ کی ایڑیاں! جب وہ اپنا متمتایا ہوا چہرہ کنیوں میں چھپائے ڈیوڑھی کی حق کی طرف بھاگا کرتی تو نسیم چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس کی گول گول سڈول ایڑیوں کا تعاقب کرتا، جن پر کاسنی شلوار کے آبشاری پانیچے اور گردابی بل کبھی گرتے کبھی اٹھتے کبھی اٹھتے، کبھی گرتے۔۔۔۔۔

اور پھر آخر شبرات آئی! بھابی عورتوں کی مجلس میں گئی ہوئی تھی۔ نسیم کمرے میں بیٹھا پٹانے گن رہا تھا۔ اتنے میں پھلجھڑی آگئی! رنگین شراروں کی رُح چم چم کرتی اور دالان میں کھڑی ہو گئی۔

”بھابی، یہ لو چھچھوندیں!“ اس نے ہلکی سی ہنسی دبا کر کہا۔

نسیم چونکا۔ ”اوہو، پھل جھڑی ہے؟ ذرا پٹاخوں سے بچ کے رہنا!“

”میں تو بھابی کو پوچھتی ہوں۔“ جیلہ نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔

”بھابی نہیں ہے۔“ نسیم خرگوش کی طرح بھاگتا ہوا آیا، اور مٹھی بھر

انے زمین پر مار کے بولا۔۔۔۔۔ ”یہ گئے پٹانے! اب باری ہے پھلجھڑی کی!“

جیلہ شرما کر بھاگی، ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی۔۔۔۔۔ نسیم بھاگا۔ ٹھس،

ٹھس ٹھس۔۔۔۔۔ پٹانے چھوٹ رہے تھے۔ جھرررر۔۔۔۔۔ جیلہ کا پاؤں

شلوار کے پانیچے میں الجھا اور وہ دھڑام سے گری۔۔۔۔۔ نسیم نے لپک کر سنبھالا،

اور بانہوں پر اٹھا لیا۔۔۔۔۔ اثار، شرارے!! آگ!!! دونوں کھو سے گئے، جس

طرح آتش بازی کے شعلوں میں دھو آں کھو جائے۔۔۔۔۔ اور ایک دودھیاسی بے باک ٹانگ ہوا میں ٹاپنے لگی، جیسے قوس قزح کی لڑیوں سے کھکشاں کا دھارا پھوٹ نکلے! اور پھر وہ جاگی، جھجکی، گھبرائی۔۔۔۔۔ اور بے اختیار بھاگی۔ اس کا پھنا ہوا پانیچہ پیچھے پیچھے گھسنے لگا۔۔۔۔۔ جس طرح پھلجھڑی کے ساتھ ساتھ چھچھوند رہی ہو!

دوسرے روز وہ آئی، تو سفید بوسکی کا سیدھا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ بھابی دیکھتے ہی چلائی۔۔۔۔۔ ”اے ہے۔۔۔۔۔ جی، یہ کیا لڑکاسی بن گئی ہو؟ شلوار کیا ہوئی؟“

جیلہ کا منہ گرما گیا۔ ”کل پاؤں الجھا، تو پھٹ گئی۔ میں بھی تو دھڑام سے گری بھابی۔۔۔۔۔ اب سب کے گلوڑے پانیچے چھوٹے کروانے دے دیئے ہیں۔“

”توبہ، چوٹ تو نہیں آئی؟“ بھابی نے پوچھا۔

”بہت ہلکی سی!“ جیلہ نے ایک چھپے ہوئے سرور کی جھرجھری لے کر کہا۔ اور پھر وہ یکایک جھینسی۔ اور بات ٹالنے کے لئے بولی۔ ”کل کا جلسہ کیا رہا، بھابی؟“

”بڑے مزے کا۔ بیگم غیاث نے اچھا خطبہ دیا۔ تم کیوں نہ آئیں؟“

”یونہی رہ گئی۔۔۔۔۔ خطبے میں کیا کہا؟“

”بہت سی باتیں۔ شبرات کی فضیلت اور جانے کیا کیا؟ توبہ، سب کچھ یاد بھی تو نہیں رہتا۔۔۔۔۔“

”بھابی، شب برأت میں فرشتے اُترتے ہیں؟“ نسیم نے پردے کے پیچھے

سے منہ نکال کر پوچھا۔

”اللہ میاں کی رحمت ہے بھیتا۔ فرشتے تو آتے ہی ہیں۔“ بھابی نے

ایک قسم کی روحانی سنجیدگی سے کہا۔

”اور حوریں، بھابی؟“ جیلہ نے آنکھیں جھکا کر شرارنا پوچھا۔

جگ جگ

”جگ جگ، حضور؟“ سفید داڑھی والے بیرے نے کافی کی پیالی میز سے اٹھا کر پوچھا۔

افضل نے کہا۔ ”لے آؤ۔“ کلکتہ میں آتے ہی ٹرام میں اس نے کسی کو پہلی بار جگ جگ کہتے سنا تھا۔ وہ سمجھا تھا کہ ڈم ڈم یا بج بج کی طرح کسی جگہ کا نام ہو گا اب رات کے کھانے پر جب ہوٹل کے بیرے نے پوچھا، ”سوپ، حضور؟“ تو افضل نے کہا، لے آؤ۔“ کٹلس حضور؟۔۔۔۔۔ لے آؤ! سلطانہ پڈنگ، حضور؟۔ لے آؤ!۔۔۔۔۔ جگ جگ حضور؟۔۔۔۔۔ لے آؤ! افضل نے سوچا کوئی چینی مٹھائی ہوگی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ شاید شراب ہو۔ اس خیال سے اس کے رونگٹوں میں کپکپی سی ہوئی۔ کیونکہ وہ ابھی شراب کو منہ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے دل میں فرشتہ بننے کی خواہش بھی نہ تھی۔ لیکن ہر چیز کے لئے اس نے زندگی میں خاص خاص منزلیں بنا رکھی تھیں۔ مثلاً سگرٹ۔۔۔۔۔ کالج میں وہ کئی بار سگرٹ پینا چاہتا تھا۔ لیکن اس آرزو کی تکمیل کو اس نے ایم۔ اے پاس کرنے تک اٹھا رکھا تھا۔ چنانچہ اب وہ چار مہینے سے سگرٹ بھی پیتا تھا، اور جی بھر کر پیتا تھا۔ اس کی زندگی کی شاہراہ میں اگلی منزل کا نشان قدیہ تھی۔ قدیہ کا بام یہی کوئی دو چار ہاتھ دور تھا۔ کیونکہ وہ اس کی منگیتر تھی۔ اور اگلے مہینے کی دس تاریخ کو رواجاً اس کی ملکیت میں آنے والی تھی۔ انسان کی تعمیر میں کچھ پوشیدہ رگیں ایسی بھی ہیں، جو آرزوئے ملکیت پر بے اختیار پھڑک اٹھتی ہیں۔ افضل کے پاس روپیہ تھا، اور جب بنک کی پاس

”ہاں ہاں، ضرور!“ نسیم چلایا۔ ”لیکن پھٹی ہوئی شلواریوں والی۔۔۔۔۔“

جیلہ کے گالوں پر گلابی ڈورے آئے، اور وہ پانی کے ریلے کی طرح مچل کر بھاگ گئی۔

”توبہ، ایسی بات بھی کوئی کہتا ہے بھلا؟“ بھابی نے چائے کی پیالی کھٹ سے پرچ میں رکھ کر کہا۔

”میں نے کوئی اُسے کہا تھا کچھ؟ شلوار کی بات تھی!“

”چل چپ رہ۔ بڑھا ہو گیا ہے، اور بات کی تمیز نہیں۔۔۔۔۔“

”تو میں کیا کروں بھابی؟ یہ لباس ہی بد تمیز ہے!“ نسیم نے بات ٹالی۔

بھابی کو بھی غصہ آگیا۔

”شلوار؟“ اس نے میز پر مٹکا مار کے کہا۔ ”کبھی دیکھا بھی ہے تم نے

کسی کو شلوار پہنے۔۔۔۔۔“

بک پکار کر کہتی تھی کہ میاں افضل! یہ سب روپیہ تمہارا ہے، محض تمہارا۔۔۔۔۔ تو اسے ایک خفیہ تسکین ہوتی تھی۔ اور وہ لمحہ بھر کے لئے جعلی دستخط بنانے والوں کو بھی بھول جاتا تھا! لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں جب اس نے ایک چھوٹی سی خوشنما کو بھی بنوائی، تو اس کی پیشانی پر بڑے بڑے حرفوں میں ”افضل کدہ“ لکھوایا گیا۔ اوپر انگریزی میں، نیچے اردو میں۔ جب کوئی راغبگر اچانک اس نام کو پڑھ کر گزر جاتا تھا، تو شاید افضل کی کوئی خاموش رگ مطمئن ہو جاتی تھی، کہ شکر ہے گزرنے والے کو یہ دھوکا نہیں لگا کہ شاید یہ خوبصورت مکان کریم بخش کا ہو۔ یا طوطا رام کا۔۔۔۔۔

اب اگلے مہینے اس کی ملکیتی جائیداد میں قدسیہ کا چلتا ہوا چھریا جسم بھی شامل ہونے والا تھا۔ قدسیہ کو پالنے کے بعد افضل کے ارض و سما ایک دھندلی سی افقی لکیر میں کھو جاتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا تھا کہ وہ انارکلی میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دکان کھول لے گا۔ کبھی اس کا تخیل قدسیہ کو لیکر تاج محل اور اجنٹا آرٹ کی سیاحت کے لئے چل نکلتا تھا۔ بسا اوقات اس کے تصور میں ارغوانی لہروں والے چمچاتے ہوئے پیگ گھوم جاتے تھے۔۔۔۔۔ اصل میں قدسیہ کے بعد افضل کی تمناؤں پر زنگ سالگ جاتا تھا۔ اور اسے خود محسوس ہوتا تھا کہ شاید اس کی زندگی اس گرم گرم دہکتے دہکتے ہوئے کونے کی طرح رہ جائے گی۔ جسے پانی میں ڈال کر چھن سے بچا دیا ہو۔۔۔۔۔ افضل آوارہ مزاج نہیں تھا۔ وہ آسودہ مزاج تھا۔ آسودگی ساحل کے کنارے بیٹھ کر لہریں گنتی ہے۔ آوارگی ان لہروں کی آغوش میں کود جاتی ہے۔ چنانچہ جب افضل کو معایہ خیال آیا کہ شاید جگ جگ کسی شراب کا نام ہو، تو وہ گھبرا سا گیا۔ وہ ابھی شراب پینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لائحہ عمل میں شراب کی منزل عورت کے بعد تھی۔ عورت کا وجود قدسیہ کا وجود تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی کائنات میں عورت کا روپ یا تو ماں کا روپ ہوتا ہے، یا بہن کا یا بیوی کا۔۔۔۔۔ وہ عورت کو ایک سترنگی پیگ نہیں سمجھتا تھا۔ جو انسان کی زندگی پر قوس قزح کی طرح تنی

ہوئی ہے جب وہ قدسیہ کو پالے گا تو سمجھے گا کہ دنیا کے ساتھ اس کا ایک ضروری حساب بے باق ہو گیا ہے۔ یعنی سارے جہان کی عورتوں میں اُس کے جیسے کا جو نکڑا تھا، وہ اسے مل گیا۔ افضل نے کبھی کسی سے محبت نہ کی تھی۔ لیکن پیدا ہوتے ہی اسے حق ہو گیا تھا، کہ ایک خاص عمر پر پہنچ کے وہ دنیا سے اپنے جیسے کی عورت مانگ لے۔ چونکہ وہ اتفاق سے مسلمان گھر میں پیدا ہوا تھا، اس لئے دو چار عورتیں بھی مانگ سکتا تھا۔۔۔۔۔

ہوٹل کا ڈائینگ روم کچا کھج بھرا ہوا تھا۔ تیز تیز برقی قمقمے جگمگ جگمگ جل رہے تھے۔ افضل کے سامنے والی میز پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور ایک جوان عورت بیٹھے ہوئے آکس کریم کھا رہے تھے۔ ایک بیڑا بہانے بہانے جھک کر میز کے نیچے نظر دوڑاتا تھا۔ ادھیڑ عمر والے آدمی کے گھٹنے جوان عورت کے گھٹنوں سے ملے ہوئے تھے۔ اور ان کے پاؤں ایک خاموش تال پر تاج رہے تھے۔۔۔۔۔ بائیں طرف ایک بھڑکیلی سی لڑکی بناؤ سنگار کئے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک میلے کپڑوں والا لڑکا تھا۔ ان کے سامنے چائے کی پیالیاں تھیں۔ لیکن وہ نہ تو چائے پیتے تھے۔ نہ آپس میں بولتے تھے۔ دونوں کی نگاہیں ہال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم رہی تھیں۔ یکایک افضل کی نگاہیں لڑکی سے ملیں۔ وہ جھینپ گئی۔ افضل نے پھر دیکھا۔ وہ مسکرا پڑی، اور اس کے سفید دانتوں کی لڑی سرخ ہونٹوں کے درمیان موتیوں کی طرح جگمگا اٹھی۔ وہ دیر تک کن آنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہے۔ پھر وہ میلے کپڑوں والا لڑکا کسی بہانے اٹھ کر چلا گیا۔ لڑکی نے گول گول آنکھیں گھما کر خالی کرسی کو دیکھا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی کو تچچے سے مدھم مدھم سڑ میں بجانا شروع کیا۔ اس جلت رنگ کی آواز افضل کو اپنی طرف بلانے لگی۔ لیکن اس نے تو گاؤں کی سنسان گلیوں میں بھی کسی اکیلی لڑکی کو کھلے طور پر گھورا نہیں تھا۔ اب اس بھرے ہوئے ہال میں وہ اس اجنبی لڑکی کے ساتھ کیسے جا بیٹھتا؟ اس کے دل میں ایک عجیب سا اضطراب ہونے لگا، جس میں غصہ تھا، مایوسی

تھی، عزم تھا شرم تھی۔۔۔۔۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وقت کا پیچھی اور دریا کی لہر کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ یہی اصول عورت کا ہے۔ افضل اپنے عجیب سے اضطراب میں الجھا رہا۔ اتنے میں ہال کے دوسرے کونے سے ایک لڑکھڑاتا ہوا آدمی آیا۔ اور دھم سے لڑکی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیرے نے جلدی سے آکر کھانے کا آرڈر لیا۔ ان دونوں کے گھٹنے میز کے نیچے مل گئے۔ ان کے پاؤں کسی خاموش تال پر ناچنے لگے۔ اور افضل کو بیٹھے بٹھائے یوں محسوس ہوا کہ اس لڑکھڑاتے ہوئے شرابی نے چائنا مار کر اس کے منہ کا سگرٹ چھین لیا ہے!

اتنے میں سفید داڑھی والا بیرا دروازے میں نمودار ہوا۔ افضل کو احساس شکست نے اداس کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی کم ہمتی پر شرمندہ ہو رہا تھا اگر جگ جگ کوئی تیز اور تند شراب بھی ہوتی، تو اس وقت افضل ضرور دو گھونٹ پی لیتا۔ لیکن جب اچانک سفید داڑھی والے بیرے نے اس کے سامنے شراب کی جگہ ایک چھلکتی ہوئی عورت کو لا بٹھایا، تو اس کے قدم لڑکھڑائے، جیسے چاند کے لئے ضد کرنے والے بچے کے ہاتھ میں سورج کا دکھتا ہوا لاؤ رکھ دیا جائے! اُس نے بیٹھے ہی میز کے نیچے اپنے گھٹنے افضل کے گھٹنوں سے ملا دیئے۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ عورت مسکرانے لگی، جیسے کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔ ”میں تمہاری ماں نہیں ہوں، بہن نہیں ہوں، مجھ سے ڈرتے کیوں ہو؟۔۔۔۔۔“

”بوائے، میرا بل لاؤ۔“ افضل نے زور سے چیخ کر کہا۔

آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس بد تمیزی پر ناک چڑھائے۔ وہ عورت غصے سے کانپ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے موٹے موٹے نتھنے پھول گئے۔ اور اس نے سفید داڑھی والے بیرے کو قہر آلود نظر سے دیکھ کر کہا۔ ”تھو، غفور چاچا۔ سفید بال ہو گئے تیرے۔ پر آدمی کی پرکھ نہ آئی اب تک!“ اور پھر وہ تیرتی ہوئی مرغابی کی طرح میزوں کے گرد منڈلانے لگی۔ ایک موٹا سا آدمی

وسکی کا گلاس سامنے رکھے اونگھ رہا تھا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا، اور زہر لب بڑبڑایا۔

”جگ جگ؟“

”جگ جگ!“ عورت نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر وہ دونوں گھٹنے جوڑ کر بیٹھ گئے۔

ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نو دس برس کا گول مول سا چھو کر اس کی طرف لپکا۔ ”گوری بی بی، جناب؟“ چھو کرے نے افضل کی انگلی پکڑ کر پوچھا۔

افضل نے اُسے جھڑک دیا۔

”کالی بی بی جناب؟“ چھو کرے نے دوسری پیشکش کی۔

افضل نے پھر اُسے ڈانٹ دیا۔

”جگ جگ جناب؟“ چھو کرے نے اصرار آکھا۔

افضل نے اسے دھکا دے کر پرے پھینک دیا۔

افضل میں اخلاقی جرات کے ساتھ ساتھ ظرافت کا مادہ بھی عنقا تھا۔ ورنہ وہ اس گول مول چھو کرے کو دھکیل کر پرے نہ ہٹاتا۔ وہ ننھا سا لڑکا راہگیروں پر لپک لپک کے ان کے معیار کا سودا کیا کرتا تھا۔ اس کے بیوپار میں کئی قسم کی جنس تھی۔ کالی بی بی اور گوری بی بی رنگت میں امتیاز تھا۔ نسل میں فرق تھا۔ بازار الگ الگ تھے، قیمت جدا جدا تھی۔۔۔۔۔ لیکن جگ جگ ایک بین الاقوامی چیز تھی۔ وہ بنی نوع انسان کی مشترکہ جائداد ہے۔ اس میں کالے گورے پیلے بھورے کی تمیز نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے، اور ہر کسی کے لئے ہے۔ ٹوکری میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح جس کی ایک پھانک کاٹ کر اسے خفیہ طور پر ننگا کر دیا ہو!

افضل جس طرف جاتا تھا اس کے سامنے جگ جگ آ جاتی تھی کلکتے کی ساری شاہراہیں ایک ہی منزل پر مل رہی تیں ٹیکسیوں میں جگ جگ تھی،

رکشاؤں میں جگ جگ تھی، گھوڑا گاڑیوں میں جگ جگ تھی۔۔۔۔۔ وہ سرسراتی ہوئی خوبصورت ساریوں میں تھی۔ اس نے رنگ برنگ فراق پنے ہوئے تھے وہ عظیم الشان کمروں میں تھی۔ وہ خوشنما پردوں کے پیچھے تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی تھی، جو کچھ تھی۔۔۔۔۔ ٹوکری میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح تھی۔ جس کی ایک پھانک تراش کر اسے خفیہ طور پر ننگا کر دیا ہوا!

وہ ایک لدی ہوئی ٹرام میں پھنس کر کھڑا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک نازک سی لڑکی تھی، جس کے تراشے ہوئے بال پھولوں کی طرح مہک رہے تھے۔ جب ٹرام رکتی تھی، تو ہر ہچکولے کے ساتھ اس لڑکی کا سارا بوجھ افضل کے کندھوں پر آگرتا تھا۔ اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے عطروں میں بسا ہوا ریشم کا تھان اس پر ڈال دیا ہو۔۔۔۔۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا، کہ ٹرام قدم قدم پر رکے، اسے گام گام پر ٹھوکریں لگیں، اور پھر وہ کسی دوسری ٹرام سے ٹکرا کر ٹوٹ جائے۔۔۔۔۔ جیسے تارے ٹوٹتے ہیں! لیکن دعائونے کے لئے بھی ہمت درکار ہے۔ ٹرام گڑگڑاتی بھاگی جا رہی تھی۔ ایک تندخو نوجوان کھسکتا ہوا آگے بڑھا، اور ان دونوں کے درمیان گھس کر کھڑا ہو گیا۔ اب افضل کو شاید پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ ہچکولے لگنے کے لئے ضروری نہیں کہ ٹرام کو جگہ جگہ رکن پڑے!

”نان سنس“ اس لڑکی نے غصے سے نوجوان کو ڈانٹا۔

”جگ جگ!“ نوجوان نے اس کے کندھے پر ٹھوڑی رگڑ کے کہا۔

”جگ جگ!“ وہ مسکرا پڑی۔۔۔۔۔

عین اس وقت افضل کو سفید داڑھی والا بیڑا یاد آ گیا۔ اور پھر وہ بھڑکیلی لڑکی جو چائے کی پیالی پر چچہ مار کر جلتنگ بجارہی تھی۔۔۔۔۔ لیکن پھر اچانک اسے قدسیہ یاد آ گئی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک زبردست گالی دی۔ وہ کلکتے میں شادی کا سامان خریدنے آیا تھا۔ اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ وہ ہر راہ چلتی عورت کے قدموں میں پامال ہو جائے۔ اس نے جیب سے چیزوں کی

فہرست نکالی، اور ایک بہت بڑی دو منزلہ دکان میں چلا گیا۔

یہ دکان کلکتے کی بڑی دکانوں میں سے تھی۔ اس میں مختلف چیزوں کے لئے الگ الگ سکشن تھے۔ ہر سکشن میں گاہکوں کی مدد کے لئے آدمی یا عورتیں مامور تھیں۔ سیشنری والے حصے میں ایک خریدار کاؤنٹر پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت جس کے چہرے پر جھریوں کی پہلی لہرائیں والی تھی، بڑی مستعدی سے چیزیں نکال کر لا رہی تھی۔ رائٹنگ پیڈ، لفافے، سیاہی۔۔۔۔۔ اور پھر خریدار نے ادھر ادھر دیکھ کر زیر لب کہا۔ ”جگ جگ!“ عورت کے سنجیدہ چہرے میں کچھ تبدیلی ہوئی۔ اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر مسکرا پڑی۔

ایک خوبصورت اور جوان جوڑا سنگار کی الماریوں کے پاس گھوم رہا تھا وہ دھیمی دھیمی آواز میں سرگوشیاں کر رہے تھے، اور ان کی بے تاب آنکھیں ایک دوسرے کو اپنی اتھاہ گہرائیوں میں ڈبو رہی تھیں۔ تین بے باک چھوکرے سگرٹ پیتے ان کے پاس سے گذرے۔ انہوں نے بنی ٹھنی ہوئی دلہن کو گھور کر دیکھا۔ پھر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور سگرٹ کا دھواں زور زور سے موم کے ان رنگین مجسموں پر چھوڑنے لگے۔ جو نمائشی ساڑھیاں، گاؤن اور فراک پنے کھڑے تھے۔

ان مجسموں کے اعضاء، اقلیدس کی شکلوں کی طرح متناسب تھے۔ ان کے انداز میں دنیا بھر کی رعنائیوں کو منجمد کر دیا گیا تھا۔ اگر کوئی آرٹسٹ ان کے بدن میں تھوڑا سا لوچ، تھوڑی سی حرارت ڈال سکتا تو یقیناً گاؤنوں اور فراکوں اور ساڑھیوں کے ساتھ وہ بھی منگے داموں بک جاتے! افضل ایک مجسمے کے سامنے کھڑا ہو گیا، جس نے سلیمے ستارے والی آسمانی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ اس کے رنگین رخساروں کو دیکھتا رہا اور پھر ساڑھی دیکھنے کے بہانے اس نے مجسمے کی ٹھوس کمر کو زور سے دبا دیا اس کے دل میں ایک زبردست خواہش ابھری کہ وہ لپک کر اس موم کی مورت سے لپٹ جائے اور اس کے کانوں

میں چیخ چیخ کر کہے۔ ”جگ جگ، جگ جگ، جگ جگ۔۔۔۔۔۔“
 ”کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟“ عقب سے ایک جوان چھو کر
 نے پوچھا۔ افضل اچک کر ایک طرف ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی
 فراق والے مجتسمے میں یکایک جان پڑ گئی ہے۔

”جی ہاں، مجھے کچھ ساڑھیاں چاہئیں، کچھ فراق۔۔۔۔۔۔“ اس نے
 جلدی جلدی جواب دیا۔ گھبراہٹ میں وہ اور کوئی بات نہ بنا سکا۔

وہ لڑکی اسے ایک تلوے کمرے میں لے گئی۔ اور الماریاں کھول کر
 قسم قسم کی ساڑھیاں نکالنے لگی۔ افضل کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ
 ٹکرا رہا تھا۔ وہ ساڑھیوں کی جگہ فراق والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے شرارت
 سے منہ پھلایا۔ اور پھر ایک ملائم سی ریشمی ساڑھی کے نیچے ان کی انگلیاں
 اچانک مل گئیں۔ وقت کی رفتار لمحہ بھر کے لئے تھم گئی۔ افضل کے دل کی
 گہرائیوں سے جگ جگ کا لفظ ایک مستانہ ترنم کے ساتھ ابھرا، لیکن گلے تک
 آ کے اٹک گیا جیسے ناچتی ہوئی رقصہ کا پاؤں دھم سے اگلدا ان میں پھنس
 جائے۔۔۔۔۔۔ اس نے جلدی جلدی ساڑھیوں کا پلندا سنبھالا اور باہر نکل آیا۔
 سڑک کے کنارے ایک خالی رکشا والا پتے سے لگا اونگھ رہا تھا۔ افضل اچک کر
 اس میں سوار ہو گیا رکشا والا ہر بڑا کر اٹھ بیٹھا اور نیم خوابی کی حالت میں بولا۔
 ”کہاں چلیں گے حضور؟ دھرم تلے؟“

”حرامزادہ۔“ افضل کڑک کر بولا۔ ”دھرم تلے میں تیری ماں ہے
 سالے؟“ رکشا والے نے ایک زور کی جمائی لی۔ وہ ایک سدھے ہوئے
 گھوڑے کی طرح رکشا میں جُت گیا۔ اب اس کی نیند بھی دور ہو گئی تھی۔
 ”جگ جگ، حضور؟“ اس نے رکشا کھینچتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں سالے ہاں۔“ افضل دوبارہ کڑکا۔ جگ جگ ماں نہیں ہے، جگ
 جگ بہن نہیں ہے، جگ جگ بیوی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ تو کیا جگ جگ سانپ ہے؟
 وہ اپنے ڈرپوک ضمیر سے لڑتا جا رہا تھا!

کٹی ہے رات تو۔۔۔۔۔۔

”اوہو، آپ کو اعتراض ہے؟ معاف۔۔۔۔۔۔“ وہ میری طرف دیکھ کر
 بولی۔ اور پھر کمپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند کر کے یک لخت چپ ہو گئی۔
 ”جی نہیں۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ شاید آپ کو تکلیف۔۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔۔“
 میں نے نادل بند کر دیا۔ اور برتھ سے اٹھ کر ہکلاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
 ہکلاتا میری عادت نہیں۔ لیکن جب یکایک کوئی خوبصورت عورت میرے
 سامنے یوں آ جائے جیسے آسمان سے ٹوٹا ہوا تارا گر پڑا ہو، تو مجھے وحشت سی
 ہونے لگتی ہے۔ وحشت نہیں، ایک گوناگوں کیفیت کہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا
 کہ اے شعلہ جوالہ! ذرا سنبھل کے۔ تیرے سامنے پروانہ بھی ہے، جو جل
 جائیگا۔۔۔۔۔۔

شعلہ جوالہ! ہائے، یہ لفظ یاد آتے ہی میرے دائیں گال پر ایک ہلکا سا
 تھپڑ لگتا۔ کل جب ہم سب لوگ ہمایوں کے مقبرے کی طرف پک پک پر گئے،
 تو پرانے قلعے کی ایک ٹوٹی ہوئی خندق سے اُلجھ کر حمیدہ زور سے ہوا میں اچھلی۔
 اور اگر میں نے اُسے بڑھ کر سنبھال نہ لیا ہوتا، تو غالباً وہ منہ کے بل گرتی۔ اور
 اس کی تیکھی ناک کے ساتھ جو ایک مصوّرانہ تخیل وابستہ ہے، ضرور چُپٹا جاتا۔
 ”اوئی اللہ! مجھے چھوڑیے۔“ اس نے میری گرفت سے نکلنے کی ایک
 تکلفانہ کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں اس کے گال دیکھ کر جل سا گیا، جو لال لال
 انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اے شعلہ

بولی۔ اور پھر دروازے کی چٹخنی اندر سے بند کر کے ایک لخت چپ ہو گئی۔
اعتراض؟ ارے، معاذ اللہ کون کافر اس گنہ بے لذت کا بار اٹھاتا۔ میں
نے سوچا، چلو گھڑی دو گھڑی کے لئے رنگینی محفل کا سامان ہوا۔ کہاں روز روز
ایسے رومان ہاتھ آتے ہیں۔ کہ رات کا سناٹا ہو۔ ریل کی ٹھٹ ٹھٹ گڑ گڑ عمر
رواں کی طرح لمبی مسافتوں کو دامن میں لپیٹتی ہوئی بھاگی جا رہی ہو۔ ڈبے
میں امریکی کرٹل بے ہوش سویا ہوا ہو۔۔۔۔۔ عین اس وقت جوان رعنائیوں
سے چھلکتی ہوئی ایک حسین عورت یوں آجائے، جیسے راہ چلتے مسافر کی جھولی
میں پتے ہوئے انگووروں کا خوشہ ٹپک پڑا ہو۔۔۔۔۔ اور پھر ڈبے میں کوئی خالی
برتھ بھی نہ ہو!

وہ اپنا اُونی اور کوٹ اُتار رہی تھی۔ میں نے کوٹ تھام کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ ”شکریہ“۔ اس نے بھیگی بھیگی سی مترنم آواز میں کہا۔ آسمانی ریشم کی لہراتی ہوئی ساڑھی میں وہ ایک مرمیں مجتسمے کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ یا یوں کہئے، کہ چودھویں کے چاند کا عکس کسی گرتی ہوئی آبشار کی نیلا ہٹوں میں ہو لے ہو لے رقص کر رہا تھا۔

”ہوا کتنی سرد ہے۔“ میں نے کھڑکیوں کی جھلکیاں بند کرتے ہوئے کہا ”آپ کے ساتھ اور کوئی سامان نہیں کیا؟“

”جی نہیں۔“ وہ اپنا چھوٹا سا چرمی بیگ گود میں ڈال کر میرے بڑے ٹرنک پر بیٹھ گئی۔ ”زندگی کا بوجھ خود کیا کم ہے؟“ اس نے آہستہ سے زیرِ لب کہا۔ ”یہ گر انبار زندگی!“ اس نے ایک آہ سی بھری۔

”اوہو، آپ ٹرنک پر کیوں بیٹھی ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”یہ برتھ جو خالی ہے“

”جی نہیں شکریہ۔ میں آپ کو تکلیف نہ دوں گی۔“

”اٹاھہ تکیف کیسی؟ برتھ آپ کا ہے۔ شوق سے استعمال کیجئے۔“

”آپ اصرار نہ کریں۔ میں بہت آرام سے ہوں۔“

وہ حمیدہ کی بات تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کے ناز اٹھانے کی مشق تھی۔ لیکن اس وقت جو خوبصورت خاتون یک بیک میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اس کے تجاہل عارفانہ اور ایک نمایاں سے عالم استغراق نے مجھے ہکھلانے پر مجبور کر دیا۔

ہمارے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں صرف دو نشستیں تھیں۔ اُوپر والی سیٹ پر ایک امریکی کرٹل لیٹے ہوئے تھے۔ نچلے برتھ پر میرا بستر تھا۔ دہلی سے چل کر کچھ دیر تو ہم دونوں مدبرانہ سی بحثوں میں اُلجھے رہے، جن کے دوران میں بہت سی حکومتوں کے بنجے ادھیڑے۔ بہت سی قوموں کے چارک گریبان سی دیئے گئے۔۔۔۔ اور کوئی رات کے دس بجے کے قریب جب ہم غالباً ساری دنیا کی پیچیدہ گتھیاں سلجھا چکے، تو کرٹل صاحب اچک کر اپنے برتھ پر چڑھ گئے اور اپنی نیند کے چمن میں اُونچے اُونچے خراٹوں کا ارغنون بجانے لگے۔ کچھ ایسی بات ہے، کہ چلتی گاڑی میں مجھے نیند بہت کم آتی ہے۔ شاید بچپن میں مجھے پنگوڑوں کے جھولے نصیب نہیں ہوئے۔ چنانچہ میں نے وقت کئی کا سامان کیا، اور ڈی۔ ایچ لارنس کی ایک ترقی یافتہ کتاب نکال کے رکھ لی!

طوفان ایکسپریس رات کے ستائے میں فرائے بھرتی جا رہی تھی۔ امریکی کرنل کسی بھیانک خواب سے متاثر ہو کر خرائٹوں میں شدید قسم کی گولہ باری کر رہے تھے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی لیڈی چیڑلے جوانی کے سمن زاروں میں۔۔۔۔۔ خیر۔ جب ٹرین علی گڑھ کے اسٹیشن پر جا کے رکی، تو یکایک ایک رنگین رخساروں والی بھڑکیلی عورت بجلی کی طرح کوند کر ہمارے ڈبے میں داخل ہوئی۔ میری آنکھیں خیرہ سی ہو گئیں۔ منہ کھل سا گیا۔ اور ماننا پڑے گا کہ میں کچھ بوکھلا کر اٹھا بیٹھا۔

”اوہو، آپ کو اعتراض ہے؟ معاف-----“ وہ میری طرف دیکھ کر

”آپ کو کچھ پریشانی ہے؟“

”پریشانی؟۔۔۔۔۔جی! یہ تو زندگی کا دوسرا نام ہے۔“

”بہت خوب!“ میں نے ذرا شوخی سے کہا۔ ”اگر آپ مصور نہیں تو

شاعر ضرور ہیں!“

وہ مسکرائی۔ ”جی شاید۔ اپنا اپنا خیال ہے۔۔۔۔۔خیر۔۔۔۔۔“

”آپ بہت افسردہ ہیں۔“ میں نے ہمدردی سے کہا۔ ”اگر آپ کا سفر

لبا ہو، تو آرام سے سو جائیے۔“

”سفر تو بے شک لمبا ہے۔ بہت طویل۔ لیکن منزل کا نشان کسے ملتا

ہے۔ اگر ملے بھی تو بھی سراب ہے۔“ اس نے اپنی بے چین نگاہوں کو ڈبے

کی محدود چار دیواری میں گھمایا اور پھر کہنے لگی۔ ”ابھی آپ کہتے تھے کہ میں

مصور ہوں یا شاعر۔ کاش میں کچھ تو ہوتی۔ میری تو آرزو ہے کہ زندگی کا ایک

مکمل شاہکار بناؤں۔۔۔۔۔جس کی لکیریں ٹوٹی ہوئی قسمت کی طرح ٹیڑھی ہوں،

جس کی سانس میں کائنات کی ازلی ہچکیاں تڑپ رہی ہوں۔۔۔۔۔۔۔اے کاش!“

اس نے ایک دلدوز آہ بھری۔ وہ درد کی کسی بے چین کک سے جھرجھریاں

لے رہی تھی۔ نہ جانے اس کے ہانپتے ہوئے سینے میں کن کن المناک جذبوں

کا جوار بھانا اُٹھ رہا تھا۔

وہ کبھی ایک تھکے ہوئے خوابیدہ انداز سے بولتی تھی۔ کبھی اس کے

عتابی ہونٹوں پر خاموشی کا غبار سا چھا جاتا تھا۔ اس کا نام شکیلہ تھا۔ وہ ایک سیشن

جج کی بیوی تھی۔ اسے دنیا کی ساری نعمتیں میسر تھیں۔ وہ اُونچے گھر پیدا ہوئی۔

کشمیر کے شاداب خیابانوں میں پلی۔ ہریالی چٹانوں اور گانے والے جھرنوں کے

ساتھ کھیل کر جوان ہوئی۔ وہ جہاں کہیں بھی۔ کلب کی محفلیں اس کے دم

سے آباد ہو جاتی تھیں۔ رقص گاہوں کی فضا اس کے وجود سے مہک اٹھتی

تھی۔۔۔۔۔”لیکن معاف کیجئے۔“ وہ یکایک جھجک گئی ”میں یونہی آپ کی سمع

خراشی کر رہی ہوں۔ معاف۔۔۔۔۔۔۔“

”ذرا دیکھئے تو“ میں نے التجا کی۔ ”آپ ساری رات کیسے گزاریں

گی؟“ ”گزر ہی جائیگی۔“ اس نے دھیمی آواز سے کہا۔ ”یہ تو ایک رات ہے۔

سہارا تنکے کا بھی ہو، تو زندگی بیت جاتی ہے۔“

”آپ تو مجھے شرمندہ کرتی ہیں۔“ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر

اسے اٹھایا، اور برتھ پر بٹھا دیا۔

اس نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اور پھر آنکھیں جھکالیں

میرے ہاتھوں میں ابھی تک بجلی کی لہری تڑپ رہی تھی۔ لیکن اس کی سہمی

ہوئی نگاہیں دیکھ کر مجھے پشیمانی کا احساس ہونے لگا۔

”معاف کیجئے گا“ میں نے معذرت کی۔ ”آپ کو برا سو نہیں لگا؟“

”جی نہیں۔“ اس نے اپنی نازک ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کے کہا۔

”دنیا میں کمزور ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔“

میں شرمندہ ہو گیا، اور ٹرنک پر بیٹھ کے سگرٹ سلگانے لگا۔ وہ چھت پر

جگمگاتے ہوئے قمقمے سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کی سرمیں آنکھوں

کے دامن میں پُر اسرار چشمے سے ابل رہے تھے۔ برتھ پر بیٹھی ہوئی وہ کسی

مصور کا رنگین شاہکار نظر آتی تھی۔ جو قوس قزح کی لڑیوں کو ملا کے بنایا گیا

ہو۔۔۔۔۔یا شاید وہ کھکشاں کا ایک آوارہ ٹکڑا تھی۔۔۔۔۔۔۔میرا تخیل چوری

چوری شاعری کر رہا تھا!

”آپ کہاں تک جائیں گی؟“ میں نے وہ سکوت توڑنا چاہا جو میری

فجالت نے کمپارٹمنٹ پر طاری کر دیا تھا۔

”جی؟“ وہ جیسے کسی گہرے خواب سے چونک اُٹھی۔ ”کیا فرمایا آپ

نے؟“

”معاف کیجئے گا۔ میں یونہی آپ کے استغراق میں مغل ہوا۔“

”جی نہیں۔ آپ شوق سے فرمائیے۔ میں تو یونہی بیٹھے بیٹھے کھو جاتی

ہوں۔“

میں نے خاص اہتمام سے رگڑ رگڑ کے حجامت بنائی۔ اور خوب صابن مل کر رات کے ٹھنڈے ہوئے پانی سے نہانا شروع کیا۔ تاکہ جب اس کی آنکھ

وہ ایک تھکی ہوئی انگڑائی لے کر برتھ پر نیم دراز ہو گئی۔۔۔۔۔ "شکریہ"۔ اس نے ایک المیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اگر دنیا میں انسانی ہمدردی نہ ہوتی تو یہ زمین آگ کا انگارہ بن جاتی۔ لیکن ہر چیز کی ایک انتہا ہے۔ آپ میری آپ جتنی سنا چاہتے ہیں؟ آپ کی دلچسپی سر آنکھوں پر۔ لیکن سنتے سنتے جب آپ کا شوق مایوسی میں بدل جائے، تو خدا را مجھے بتا دیجئے گا۔ تاکہ میری زندگی میں لمحہ دو لمحہ کے لئے آپ کی ہمدردی کا جو ننھا سا چراغ روشن ہوا ہے، وہ بجھنے نہ پائے۔ میں ڈرتی ہوں کہ شاید صبح کی پو پھٹتے ہی آپ کے دل میں میرے لئے نفرت کا فوارہ پھوٹ بیسے گا۔ کون جانتا ہے کہ آپ کو مجھ پر غصہ بھی آئے۔ کیونکہ میں نے آپ کا برتھ ہی نہیں چھینا، بلکہ آپ کے دل سے ہمدردی کے آگینے بھی چرا لئے ہیں۔ شاید صبح ہوتے ان آگینوں کو ٹھیس لگ جائے۔۔۔۔۔ کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟۔۔۔۔۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔۔۔۔۔ اُف میرے خدا۔۔۔۔۔ آپ مجھے ضرور معاف کر دیں۔۔۔۔۔ ضرور معاف۔۔۔۔۔" وہ اپنے تعیل کی رو میں بہتے بہتے خاموش ہو گئی۔ اس کی گھنی پلکیں تھکی ہوئی غنودگی کے ساتھ جھکنے لگیں۔ اور تھوڑی دیر میں وہ نیند کی پُر سکون آغوش میں سو گئی میں نے آہستہ سے اپنا سرخ ریشم کا لحاف اٹھا کر اس پر ڈال دیا۔

وہ سوئی ہوئی تھی۔ یا شاید وہ غیند کے پردے میں بھی زندگی کے کسی خوفناک تانے بانے میں الجھ رہی تھی، جو مکڑی کے جالے کی طرح اس کے دل اور دماغ پر چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی سانس کے دھیمے دھیمے اُتار چڑھاؤ سے ریشمیں غلاف میں ننھی ننھی پھریریاں اُٹھ رہی تھیں۔ سرخ لحاف کی سلوٹوں میں اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح تھا۔ جو شفق شام کی اوٹ میں چوری

کھلے، تو میں زندگی کی ایک نئی صبح کا خوش آئند پیام سنانے کے لئے تیار ہو جاؤں۔۔۔۔۔ اتنے میں گاڑی رکی۔ غالباً ”گیا“ کا سٹیشن تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد یکایک ہمارے ڈبے کا دروازہ کھلا۔ اور ایک پُر شوق آواز پکاری۔۔۔۔۔ ”ہلو ڈارلنگ تم یہاں ہو؟ میں تو سب ڈبوں میں کھوج آیا۔ میں نے کہا۔ میری شکل کہاں کھو گئی؟“

وہ شاید اس کا شن جج خاوند تھا۔

”توبہ، میں تو یوں سو گئی کہ ہوش ہی نہ رہا۔“ ایک خوابیدہ آواز ترنم ریز ہوئی۔ پھر یکایک وہ آواز جھجکی، جھنجھلائی اور آہستہ سے بولی۔ ”آپ ذرا چلے جائیے، ڈارلنگ۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

”لیکن سامان کہاں ہے، ڈارلنگ؟ چہر اسی ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”آیا کے پاس کسی ڈبے میں ہو گا۔۔۔۔۔ توبہ آپ چلے بھی جائیے، میں

ابھی آتی ہوں۔۔۔۔۔“

”ذرا ٹھہرو، شکل۔۔۔۔۔ یہ بستر تو بند ہوا لیں۔“

”ہائے میرے اللہ! بستر میرا نہیں ڈیر۔ آپ ذرا چلے جائیے نا۔۔۔۔۔“

”اوہو، ڈارلنگ، کیا بات ہے؟“ جج صاحب حیران ہو رہے تھے۔ ”میں نے کہا

پھر بتاؤں گی۔ توبہ آپ جاتے بھی تو نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

غالباً جج صاحب پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے۔ وہ دیر تک کپار ٹمنٹ کے دروازے پر منڈلاتی رہی۔ میں نے غسل خانے کی دوسری کنڈی بھی اندر سے چڑھا دی۔۔۔۔۔ جب گاڑی چلی، تو میں نے غسل خانے کی جھلملی اٹھا کر باہر جھانکا میرے رنگین سپنے صابن کے بلبلوں کی طرح ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے پلیٹ فارم پر دو تین وردی پوش چہر اسی سامان اٹھوائے جا رہے تھے۔ پیچھے پیچھے دونوں میاں بیوی ہاتھ میں ہاتھ دیئے خراماں خراماں چل رہے تھے وہ ہنستی ہوئی مقلتی ہوئی جا رہی تھی۔ شاید وہ رات کے ڈرامہ کا ریہرسل سنا رہی تھی۔ جس میں ایک بے کس محبوبہ نے کسی جذباتی نوجوان کو خوب اُتو بتایا اور اس کا

برتھ اور بستر دونوں چھین لئے۔۔۔۔۔! دسمبر کی ٹھنہری ہوئی صبح میں بھی مجھے پسینہ آگیا۔ اور میں نے پانی کا ٹل کھول کر اس کے نیچے سر رکھ دیا۔

بہت دیر کے بعد جب میں غسل خانہ سے نکلا تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔

امریکی کرنل صاحب اپنے بستر پر بیٹھے صبح کی چائے نوش کر رہے تھے۔ میری سیٹ پر دو چینی ہوا باز اور ایک خان صاحب قسم کے کپتان بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے ٹرنک پر ایک انگریز میجر رونق افروز تھے۔ میں نے اپنا بستر اٹھا کے تہہ کرنا شروع کیا۔ تکیوں میں سے ایک مشام نواز مہک نکل کر سارے کمرے میں بکھر گئی۔ اور ایک نازک سالبا بال کالے ریشم کے تار کی طرح اڑتا ہوا کپتان صاحب کے اخبار پر جا لگا۔ انہوں نے اسے والمانہ عقیدت کے ساتھ انگلی پر انگوٹھی کی طرح لپیٹ لیا۔ میری طرف کن آنکھیوں سے دیکھ کر مسکائے۔ اور پھر جھوم کر لاپنے لگے۔۔۔۔۔

کئی ہے رات تو ہنگامہ گسٹری میں تری
صحرا قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی!

سب کا مالک

سب کا مالک کون

اللہ!

سب کا مالک کون؟

اللہ!

سب کا مالک کون؟

جمعرات کے جمعرات نندی گرام کی بستی میں وہ پگلا سا فقیر آیا کرتا تھا لوگ اسے سائیں بابا کہتے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح اچھلتا، پھلانگتا، دوڑتا مچلتا اور پیپھڑوں کا پورا زور لگا کر سب کا مالک کون؟ اللہ----- کا ورد کیا کرتا تھا۔ بچے اس سے مانوس ہو گئے تھے۔ مائیں اس پر چڑھاوے چڑھاتی تھیں۔ گاؤں کے مکھیا لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ ایک روز ننھی رضیہ ہاتھ میں سرسوں کے تیل کا کٹورہ اٹھائے جا رہی تھی، کہ اچانک ٹھوکر کھا کے گر گئی۔ تیل کا کٹورہ چھلک کر نالی میں جا پڑا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔ اور دل میں خوف کے مرغولے لپکنے لگے۔ رضیہ کی ماں نے بڑی منت سماجت کے بعد رشی کیش بابو کی بیوی سے دو آنے ادھار لئے تھے۔ بجزنگ لال بننے نے بڑی مشکل سے دوٹی کا چھٹانک بھرتیل دیا تھا۔ رضیہ کا باپ کئی روز کے بعد دریا سے مچھلی پکڑ کے لایا تھا۔ رضیہ کی ماں چوڑھے پر ہنڈیا دھرے تیل کے انتظار

میں بیٹھی تھی۔ اب جو رضیہ نے دیکھا کہ آدھا تیل اس کے کپڑوں میں، اور آدھا زمین پر لٹھ گیا ہے، تو اس نے سارا زور لگا کر رونا شروع کر دیا۔ اتنے میں دور سے سائیں بابا کی آواز آئی۔ رضیہ نے دوڑ کر اس کی انگلی پکڑ لی۔ اور منت سے کہنے لگی۔ ”سائیں بابا، سائیں بابا۔ میرا تیل لٹھ گیا ہے۔ ماں مارے گی۔ سائیں بابا تم سب کے مالک ہو، مجھے ایک دوٹی دے دو۔“ یہ سن کر جیسے سائیں بابا کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ انہوں نے پھٹکار کر ہوا میں ایک طویل جست لگائی، اور رضیہ کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ ”سب کا مالک کون؟ اللہ! سب کا مالک کون؟“ وہ چلا رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے رضیہ کے ہاتھ پر ایک دوٹی رکھ دی۔ جب رضیہ کے ماں باپ کو معلوم ہوا، کہ وہ سائیں بابا سے دوٹی مانگ کر تیل لائی ہے، تو مچھلی کا گوشت کاٹا بن کر ان کے حلق میں پھنس گیا۔ اور انہوں نے غصے میں آکر رضیہ کے دونوں گال طمانچوں سے لال کر دیئے۔ شام کے وقت جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ مسجد میں قرآن مجید کا سبق لینے گئی، تو مولوی صاحب نے کہا۔ آج مالک آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں فرصت نہیں۔ جاؤ۔“

”کس کے مالک مولوی جی؟“ رضیہ نے پوچھا۔

”ہم سب کے مالک بیٹی۔ جا۔ تو نہیں جانتی۔“

”ہاں ہاں جی۔ میں جانتی ہوں۔“ رضیہ کی آنکھوں میں غیر معمولی سی

چمک آگئی۔ ”سائیں بابا جو کہتے ہیں کہ ہم سب کے مالک اللہ میاں۔-----“

رضیہ کا فقرہ دانتوں کے درمیان کٹکٹا کے رہ گیا۔ مولوی صاحب نے

ایک زمانے کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور ڈپٹ کر بولے۔ ”کافر کی بیٹی! دو

سال سے پڑھ رہی ہے۔ ابھی اتنی تمیز نہیں آئی حرامزادی کو۔-----“

رات کو جب وہ تاروں کی چھاؤں میں پلنگڑی بچھا کے لیٹی، تو دریا سے

آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کے تہمتائے ہوئے گالوں پر مرہم کا

پھاہا سا رکھ دیا۔ خیالوں کے عجیب عجیب تانے بانے اس کے دماغ میں الجھنے

لگے۔ اس کا چہرہ گویا فالتو تھا کہ جو دیکھتا تھا اس پر بے تکلف چائے جمادیتا تھا۔ اسے اپنی بے پناہ مجبوری پر رونا آنے لگا۔ اور اس کے دل میں ایک زبردست خواہش ابھری کہ وہ اپنے روح کی ساری پنہائیوں کو اکٹھا کر کے آنکھیں میچ لے، اور دبی زبان سے کہے کہ اے ہم سب کے مالک، تو جو کچھ بھی ہے، جہاں کہیں بھی ہے، میری ایک بات سن لے۔۔۔۔۔۔ نہ جانے اس کے دل میں کہا کیا شکوے تھے، کیا کیا فریادیں تھیں جن کو وہ اپنے خیالوں کی بھول بھلیاں سے کرید کرید کے نکالنا چاہتی تھی۔ لیکن مالک کے تصور نے اس کے تجسس کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ دائیں گال پر سائیں بابا اور بائیں گال پر مولوی صاحب کی انگلیوں کے نشان تازہ ہو کے ابھر آئے۔ رات کے ستائے میں ایک بیٹھا بیٹھا سا ارتعاش اٹھ رہا تھا۔ دور حویلی سے جھم جھم جھم، چھما چھم جھم کی مدھم مدھم سی آواز آرہی تھی، جیسے بہت سی تیتریاں اپنے پروں میں گھنگھرو باندھ کر پھولوں پر ناچ رہی ہوں۔ رضیہ نے چوری چوری گردن اٹھا کر اپنے ماں باپ کو دیکھا جو آنگن میں تخت پوش پر لیٹے ہوئے خزانے لے رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے دل کو دھوکا دینے کے لئے چادر کا گول مول اور لبوتر سا ڈھانچہ بنا کے چارپائی پر رکھ دیا اور دبے پاؤں باہر نکل آئی سونی اور تاریک گلی میں اسے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن مالک کو دیکھنے کا حق اس نے بڑی محنت سے خریدا تھا۔ پے درپے طمانچوں کی سرسراہٹ اس کے گالوں میں ابھی تک آگ سی جلا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں سائیں بابا کے نعروں کی گونج تھی۔ مولوی صاحب کے لمبے لمبے وعظ تھے۔ مندر کی گھنٹیاں۔ تلسی کے بوٹے۔ نماز۔ روزے۔ نیاز مالک کے لئے، مالک کے نام پر، مالک کی راہ میں۔۔۔۔۔۔ رضیہ کے دل میں مالک کا جو خلط ملط سا تصور تھا، وہ اسے اندھیرے اور سنسان گلی میں بھی روشنی دکھاتا لئے جا رہا تھا۔ اس کے شوق اور تجسس میں پیسیرانہ وار فتگی کا تناؤ آگیا تھا۔ اگر دنیا میں ایک اور موسیٰ کے لئے جگہ ہوتی تو لاریب مندی گرام کی وہ تاریک اور ویران گلی کوہ طور کی بلند چوٹیوں کے ہمدوش اٹھ جاتی۔۔۔۔۔۔

بڑی حویلی کے صدر دروازے پر اس نے رامانند چوکیدار کی منت کی اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ رامانند ایک لمبے سے بیچ پر لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا۔ سارا سال وہ بڑی حویلی کے اندر رہتا تھا، لیکن سال میں اک بار جب مالک لگان کا حساب کرنے آتے، تو صدر دروازے میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ باغیچے میں پھولوں کی قطاروں کے درمیان مالک کا دربار لگا ہوا تھا۔ صدر میں مالک تھے۔ بائیں طرف مالک کے تحصیلدار، گماشتے، پیروی کار اور مصاحب تھے۔ دائیں جانب گاؤں کے مکھیا لوگ تھے۔ ان میں مولوی صاحب تھے، پاٹھ شالہ کے پجاری، سکول کے ماسٹر، دونوں سیٹھ بھائی بالا بخش، بجرنگ لال اور ایسے ہی چند ایک اور جو دن بھر میں دو کی جگہ تین یا چار دفعہ پیٹ بھر سکتے تھے۔ درمیان میں ریتا بوس تھی۔۔۔۔۔۔ اس کے پاؤں میں جھم جھم جھم، چھما چھم جھم جھم بجنے والے گھنگھرو تھے۔ وہ ایک پتلی سی سرخ ساڑھی پہنے شعلے کی طرح ناچ رہی تھی۔ اس کے پیچھے سازندوں کی قطار تھی۔ چنگی داڑھی والا چلی موٹا سا ہارمونیم ماسٹر، سوکھا ہوا زرد رُو سارنگی والا۔۔۔۔۔۔ ریتا اسی گاؤں کی چھوکری تھی، لیکن اب اس کا گھر کلکتے میں ہے۔ جب مالک آتے ہیں، تو گاؤں والے اسے پچیس روپے دن کے حساب سے چکا لاتے ہیں۔ ریتا کی ماں مندی گرام میں کپڑے سیا کرتی تھی۔ جب اس کا چاندو باز خاوند اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تو سیٹھ بھائیوں بالا بخش، بجرنگ لال نے اپنے قرضے کا تقاضا شروع کیا۔ دو سو روپیہ اصل زر تو ہر قسم کی جنبش سے بے نیاز تھا۔ لیکن پانچ روپیہ ماہوار شرح سود کے عوض دونوں بھائیوں نے اسے ماما بنا کر گھر میں ڈال لیا۔ زندگی کے اس الٹ پھیر میں جب ریتا پیدا ہوئی تو سیٹھ بھائی بالا بخش، بجرنگ لال کے ساتھ سارے گاؤں نے یہ محسوس کیا کہ تلسی کے پودے میں ببول کا کانٹا آگ آیا ہے۔ انہوں نے بیک آواز اس کانٹے کو گاؤں سے نکال دیا۔ لیکن کلکتے میں جاکر یہی کانٹے گلاب بن جاتے ہیں۔ اب ریتا کا بھی چرچا ہے۔ اور جب سیٹھ بھائیوں بالا بخش، بجرنگ لال میں سے کوئی بیوپار کے سلسلے میں کلکتے جاتا ہے، تو

جگھٹا لگ جائیگا۔ رضیہ نے بہتیرا کہا کہ مالک کے پاس تو نوٹوں کے بھاری بھاری پلندے ہیں۔ اس کو ان معمولی کنگنوں کی ضرورت کیا؟ وہ روئی تھی۔ ماں نے دم دلا سادے کر اس کے کنگن اتار ہی لئے۔

”آنسو نہ بہا، بیٹی۔“ باپ نے اپنے آنسو روک کر کہا۔ ”میں اس مہینے بہت سادہان اکٹھا کر لوں گا۔ اور پھر تمہارے لئے سونے کے کنگن بنوا دوں گا۔“

مہینہ بھر رضیہ کے دماغ میں سونے اور چاندی کے کنگن خواب کی طرح آتے اور جاتے رہے۔ اس کے باپ نے دن دگنی اور رات چوگنی محنت کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آٹھ دس من دھان جمع کر لئے۔ چاول کا بھاؤ روز بروز چڑھتا جا رہا تھا۔ بالا بخش بجرنگ لال کے دلال اور آڑھتی دھڑا دھڑا اونے پونے چاول اور دھان خرید کر جمع کر رہے تھے۔ آٹھ روپیہ من سے دس، بیس، پچیس، تیس، پھر پینتیس روپیہ من کا بھاؤ ہو گیا۔ لیکن کسانوں کے ذخیروں کی کنجیاں سینٹھ بھائی بالا بخش بجرنگ لال کے ہاتھ میں تھیں۔ پیٹ کاٹ کاٹ کر پچائے ہوئے چاول اور لہو پسینہ ایک کر کے جمع کئے ہوئے دھان پانچ روپیہ من کے حساب سے اٹھتے گئے۔ کچھ اصل زر میں کٹ گیا، کچھ سود میں لگ گیا۔ باقی بھی کھاتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔۔۔ اور جب گلی کوچوں میں نندی گرام کے ہنستے کھیلتے چہرے ہڈیوں کے ڈھانچے بن کر گرنے لگے، تو رضیہ کے کنگنوں کا خیال دو نوالے چاول بن کر ابل گیا۔ بچوں کی پسلیاں چڑچڑ کر کے اندر کی طرف دھنس گئیں، اور پیٹ غبارے کی طرح پھول کر ابھر آئے۔ عورتوں کی چھاتیاں سوکھ سوکھ کر ڈھلک گئیں۔ جیسے چیلوں کے پنچے میں مردار گوشت کے لو تھڑے لٹک رہے ہوں۔۔۔۔ آدمیوں کا لہو ٹھنڈی آہیں بن کر اڑ گیا۔ کشوری چرن سارا دن چوراہے میں گرا ہوا دم توڑتا رہا۔ لوگ ناک پر کپڑا رکھ کے گزر گئے، راستہ کترا کے نکل گئے۔ کسی سے یہ نہ ہوا کہ اس کے سوکھے ہوئے گلے میں پانی کا آخری گھونٹ نکا دے۔ ہم لتا کی ماں نے بیٹی

کے کپڑوں پر تیل چھڑک کے آگ لگا دی۔ اور پھر اپنے گلے میں رستی ڈال کر آم کے درخت سے لٹک گئی۔ ایک دن صبح سویرے لوگوں نے دیکھا کہ رضیہ کا باپ جھونپڑی کے باہر اوندھا پڑا ہے۔ اور ایک بھوکا پیاسا گیدڑ اس کی ایڑیوں میں دانت گاڑے خرخر مٹہ چلا رہا ہے۔ رضیہ کے باپ میں ابھی ایک رمت جان باقی تھی۔ لیکن اس کے بدن میں اتنا سہارا نہ تھا کہ وہ اس حریص درندے کے مٹہ سے اپنا پاؤں چھڑا لے۔ اس کے ہونٹ بھیج کر دانتوں کے درمیان کٹ گئے تھے۔ اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں دو گدلے سے آنسو بھرے ہوئے تھے جیسے بلور کی گولیوں پر دھند کے بادل جم گئے ہوں۔۔۔۔۔

ایک روز بجرنگ لال کا بھائی بالا بخش ان کی جھونپڑی میں آیا۔۔۔ ایک موٹی سے بھی الٹ پلٹ کے اس نے کوئی ساڑھے پانچ من دھان کا حساب جوڑا۔ جو رضیہ کے باپ نے کسی وقت بیج کے لئے اُدھار لئے تھے۔ ”بھاؤ تیس ہے۔“ بالا بخش پان چا کر بولا۔ ”لیکن میں بیس روپیہ من ہی لگاؤں گا۔ کل 110 روپے نقد ہوئے۔“

پھر اس نے نظریں گاڑ کر رضیہ کی ماں کو پرکھا۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اور پان کی پیک کا ایک بڑا سا گھونٹ غٹ کر کے نگل لیا۔

”تو فکر نہ کر۔“ بالا بخش دھیمی آواز سے کہنے لگا۔ ”رضیہ کی ماں تیری عمر ہی کیا ہے۔۔۔۔ تو جب کہے گی بھی میں رسید چڑھا دوں گا، ہاں! لیکن بھیتا کو خبر نہ لگے!“ بالا بخش نے آنکھ میچ کے مستقبل کا ایک لذیذ سا چٹخارہ لیا۔

دوسرے روز بالا بخش کا بھائی بجرنگ لال آیا۔ اس نے بھی ایک موٹی سی بھی میں ساڑھے پانچ من دھان کا حساب کیا، اور تیس کی جگہ بیس روپیہ من کے دام سے 110 روپے نقد کی رقم جوڑی۔

”روپیہ سالا کیا ہے، رضیہ کی ماں“ بجرنگ لال نے سرگوشی کی۔ ”ساری بات تو دل کی ہے۔ تو چاہے تو سارا حساب کاٹ دوں۔ آپس کی بات ہے

”بھوکی ہو؟“ موٹے بابو نے نکر کی جیب میں ہاتھ گھما کر کہا۔

یہ ریتا تھی۔

ریتا کے چوبارے میں نندی گرام کے بہت سے بچے تھے، بہت سی

عورتیں بہت سے مرد۔۔۔۔۔ ان میں سائیں بابا بھی تھا۔ وہ ایک کونے میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹ کھلتے تھے اور وہ آہستہ سے کہتا تھا، سب کا مالک کون؟ اللہ! سب کا مالک کون؟۔۔۔۔۔

جب رات ہوئی تو ریتا نے گلابی ساڑھی پہن کر سنگار کیا۔ اس نے اپنے گھٹکرے والے بالوں میں پھول لگائے، آنکھوں میں سرمہ لگایا اور بیٹھک میں چلی گئی۔ اس کے گھٹکرے چھم چھم چھم، چھما چھم چھم چھم بننے لگے، اس کی کمر سانپ کی طرح بل کھانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹوں کی ناؤ تیرنے لگی۔۔۔۔۔ زندگی کے اس دو دھارے میں ایک طرف سائیں بابا تھا۔ دوسری طرف ریتا بوس اور درمیان میں رضیہ تھی، جس کے ہاتھ میں ابھی تک مالک کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

ماما

دوسرے کمرے سے ریڈیو کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی۔ ماما اپنی کوٹھڑی کے درتچے میں بیٹھی ہوئی سوئی میں دھاگا ڈال رہی تھی۔ وہ جتنی بار سوئی کے ٹاکے پر ٹٹٹکی باندھنے کی کوشش کرتی، اس کی آنکھوں میں مکڑی کے جالے سے تن جاتے اور اس کو یوں نظر آنے لگتا جیسے ہوا میں رنگ برنگی پتلیاں سی گھوم رہی ہوں۔ صابن کے بلبلوں کی طرح سرخ سرخ، نیلے نیلے، سبز بھنور اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتے۔۔۔۔۔ اور پھر یکایک ایک عمیق اندھیرا چھا جاتا۔۔۔۔۔ ماما کے ہاتھوں میں بھی اب ایک کمزور سی کپکپاہٹ رہا کرتی تھی، اور کبھی تو وہ بیٹھے ہی بیٹھے پسینے میں شرابور ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔

اس نے سوئی اور دھاگے کو ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا، اور پھر اپنے کڑتے کے دامن سے پسینہ پونچھنے لگی۔ اس کے بال ادھ کچے ادھ کچے ہو گئے تھے اور اس کے منہ پر جھریوں کے ساتھ ساتھ ایک میلی کچیلی پیلاہٹ سی چھا گئی تھی۔ جب اسے پسینہ آتا، تو اس کے چہرے کے موٹے موٹے مسام کھل کر ابھر آتے۔ اور پھر یوں نظر آنے لگتا جیسے کسی پھٹی پرانی مچھردانی کا ٹکڑا گد لے سے پانی میں بھیگ گیا ہو۔۔۔۔۔

دوسرے کمرے میں ریڈیو کی آواز مڑھم ہوئی، اور ایک مترنم آواز نے اس کو بلایا۔۔۔۔۔ ”ماما۔“

ماما تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے گھٹنوں میں ایک کمزور سی

کٹکٹاٹ ہوئی۔ اور پھر اس کی پنڈلیوں میں گویا چیونٹیوں کی ایک لمبی سی قطار ریگنے لگی وہ لڑکھرائی، اور دروازے کا کواڑ تھام کر کھڑی ہو گئی۔

”اما۔“ اس مترنم آواز نے ذرا زور سے پکارا۔

”آتی ہوں بیگم۔“ اما نے جواب دیا، اور پھر دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کر ڈرائنگ روم میں گئی۔

بیگم نے ذرا غصے سے کہا۔ ”اے ہے اما، یہ کیا بات ہے؟ برسوں سے پکار رہی ہوں تم کو۔“

بجلی کی تیز روشنی میں اما کی آنکھوں کے جالے کچھ مدھم پڑ گئے، اور وہ بیگم کے گالوں پر گلابی ڈورے سے دیکھ کر ذرا ٹھٹک گئی۔ صاحب ہمیشہ کہا کرتے تھے، کہ غصے کے جوش میں بیگم کی دلکشی میں گلاب کھل جاتے ہیں!

بیگم نے ٹیلیفون کا ریسیور ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور ذرا نرمی سے بولی ”دیکھو اما، صاحب نے دفتر سے فون کیا ہے، کہ اُن کو چھٹی مل گئی ہے۔ اب ہم کل پہلی گاڑی سے دارجلنگ روانہ ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ آف، یہ گرمی“ بیگم نے مخملی پٹھر کے سے پیشانی مل کر کہا۔

”اللہ جانے آج اتنا اس کیوں ہے؟“ بیگم کچھ مڈھال سی ہو گئی۔

”ذرا پنکھا تیز کر دوں، بیگم؟“ اما نے دیوار پر لگے ہوئے سوچ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں اما،“ بیگم شکستہ سی ہو کر بولی۔ ”یہاں ایک مصیبت کیا کم ہے پنکھا تیز ہو تو اس ریڈیو میں ہل چل مچ جاتی ہے۔۔۔۔۔ اللہ ماری گرمی کیا ہوئی مستقل دوزخ بن گئی۔“

”میں ابھی تازہ لیموں کا شربت لاتی ہوں بیگم۔ طبیعت سنبھل جائے گی“

”رہنے دو، اما۔“ بیگم نے کہا۔ ”کوئی کہاں تک شربت پیتا جائے۔ گاڑی صبح چھ بجے چھوٹی ہے۔ تم راتوں رات میرا سامان درست کر دو۔“

صاحب کا کام بئرا کرے گا۔“

”جی اچھا، بیگم۔“

”ایک ہی مہینہ کے لئے جانا ہے۔“ بیگم نے لمبی آواز کر کے کہا۔ ”زیادہ سامان لادنے پھانڈنے کی ضرورت نہیں۔ کپڑے چھانٹ کر چڑے کے سوٹ کیسوں میں ڈال دو۔ میں بھی ابھی آتی ہوں۔ تمہارا ہاتھ بٹاؤں گی۔“

”آپ زحمت نہ اٹھائیں، بیگم میں سب سنبھال لوں گی۔“

”نہیں اما۔“ بیگم نے نرمی سے کہا۔ ”تم سے اتنا کام ہوگا، بھلا؟ میں ابھی آتی ہوں، تم چلو۔“

ریڈیو میں کوئی دھیمے دھیمے سُر میں ستار بجا رہا تھا۔ بیگم نے تھکے ہوئے انداز سے مخملی پٹھر کا گالوں پر پھیرا، اور صوفے پر نیم دراز سی ہو گئی۔

اما کی آنکھوں کے سامنے مٹری کے جالوں کی بجائے اب رنگ برنگ کی ساڑھیاں، ریشمی دوپٹے، اور مخملی قمیضیں تھیں۔ جب اس کی انگلیاں کپڑوں کی نرم نرم، گداز گداز تہوں میں دھنس جاتیں، تو اسے ایک قسم کا سکون سا محسوس ہوتا۔ اور وہ سوچتی کہ بیگم کے چھریے بدن پر جو گلاب کے پھول کی طرح ملائم اور مشکبار جلد ہے، اس کے لئے ایسے ہی نرم اور گداز کپڑوں کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ اور پھر اس نے اپنے کھدر کے قمیص کے دامن سے چہرے کا پسینہ پونچھا، اور شلواروں کی تہ لگا کر صندوق میں رکھنے لگی۔۔۔۔۔ بار بار اٹھنے بیٹھنے سے اما کی ٹانگوں میں کپکپی ہونے لگتی، اور جب وہ کسی بھاری صندوق کو زور لگا کر کھینچتی تو اس کے منہ پر پسینے کا سیلاب سا آ جاتا، اور بدن کی ہڈیاں ٹوٹے ہوئے ستار کے تاروں کی طرح جھنجھنا اٹھتیں۔۔۔۔۔ لیکن پھر یکایک کسی ساڑھی یا شلوار کی تہ سے بیگم کے سینٹ کی بھینی بھینی لپٹیں نکل کر اما کے دماغ پر نشے کی طرح چھا جاتیں۔۔۔۔۔

”اوہو، اما۔“ بیگم ایک جوان مرغابی کی طرح تیرتی ہوئی کمرے میں آئی۔ ”تم نے تو بہت سا کام سمیٹ لیا۔ مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ صاحب آگئے تھے۔“

جھریاں موٹے موٹے مسام، ٹپ ٹپ گرتا ہوا پسینہ۔۔۔۔۔ اب یوں نظر آتا تھا جیسے اس پھٹی ہوئی مچھردانی کا چیتھڑا کیچڑ میں لت پت ہو گیا ہو۔۔۔۔۔!

تی، تی، تی۔۔۔۔۔، ماما کی صورت دیکھ کر بیگم کو ابکیاں سی آنے لگیں، اس نے جلدی سے اپنا معطر پٹھر کا ناک پر رکھ لیا، اور دونوں آنکھیں زور سے بند کر کے بولی، ”اے ہے، ماما، تمہاری صورت کیا بن گئی ہے؟ ذرا جلدی سے جاؤ، میری سنگار میز پر پاؤڈر کا ڈبہ ہے، تھوڑا سا اپنے چہرے پر لگا لو۔“

”پاؤڈر، بیگم؟“ ماما حیران ہوگی۔

”ہاں ہاں، ماما“ بیگم نے بے صبری سے کہا۔ ”ذرا جلدی کرو، نا۔ میں کب تک آنکھیں بند رکھوں گی؟“

او، زندگی! او، خدا!!!

اے موت!!!

اور جب ماما واپس آئی، تو یوں نظر آتا تھا جیسے سوکھی ہوئی دلدل میں کچھ مرجھائی ہوئی کلیاں بھر گئی ہوں۔۔۔۔۔!

بیگم نے ڈرتے ڈرتے، نیم باز آنکھوں سے ماما کی طرف دیکھا، اور پھر ایک اطمینان کا سانس لیکر بولی۔۔۔۔۔ ”ہاں تو، ماما۔ ذرا جلدی جلدی کام کر لو، نا۔ صاحب کے کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔۔۔“

اور پھر بیگم نے دیکھا، کہ اس کی اونی شالیں تو ایک طرف بکھری پڑی ہیں! ”اوہو، ماما“ اس نے تنک کر کہا۔ ”تم بھی عجیب ہو۔ یہ اونی شالیں تو صندوق میں ڈالی ہی نہیں۔۔۔۔۔ ان کے بغیر دار جلنگ میں گزارہ ہو گا بھلا؟“

اُونہ، ماما!

جال

اس کے قدم ڈمگائے، وہ لجائی، لیکن پھر اس نے قینچی اٹھا کر اپنے لائے لائے سیاہ بالوں کا ایک گھنسا گھنسا کاٹ ڈالا۔ اب جیسے نرملا کا دل ٹھنڈا سا ہو گیا۔ اور اس کی پہلی کپکپاہٹ اور جھجک دور ہونے لگی۔ وہ دیوار کا سہارا لیکر بیٹھ گئی، اور تھوڑی دیر میں اس کے سامنے اپنی لمبی لمبی گھٹنگریالی زلفوں کا انبار لگ گیا۔۔۔۔۔ جیسے غصے میں پھرے ہوئے کالے کالے زہرناک سانپ اُلجھ پڑے ہوں۔ اس شام جب بوڑھا ماما گیر گھر لوٹا، تو اس نے دیکھ کر اس کا ٹوٹا ہوا جال درست ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں خوشی کی ایک لہری اُٹھی۔ لیکن جب وہ اپنے سکرے ہوئے خشک ہونٹوں سے مسکراتا ہوا نرملا کی طرف بڑھا، تو یکایک اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس کا ہاتھ جو پیار کے جھٹکے سے نرملا کے سر کی طرف اٹھا تھا، ہوا میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ اسے یوں نظر آنے لگا جیسے اتار کے ٹمٹماتے ہوئے شکوفے پت جھڑ میں گر گئے ہوں۔ نرملا نے اپنی ساڑھی کا آنچل احتیاط سے سر پر اوڑھا ہوا تھا، لیکن کمر تک جھومنے والی ریشم ایسی زلفوں کی جگہ کون لیتا؟ ماما نے غیر ارادی طور پر اپنے جال کو اٹھایا۔ اور اس کے ہاتھ ان جگہوں کو ٹٹولنے لگے جہاں نرملا کے نرم نرم بالوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ دیر تک جال کو ٹٹولتا رہا جیسے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔ وہ کچھ نہ بولا۔ وہ بولتا بھی کیا؟ وہ بول ہی کیا سکتا تھا؟ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ جال کئی روز سے ٹوٹا پڑا تھا۔ وہ روز جلی کٹی سناٹا اور کہا کرتا کہ آج دنیا کے

بڑے بڑے مایہ گیر اپنا تانا بانا بننے میں لگے ہوئے ہیں۔ اب اس کے جال کی مرمت کے لئے سوت کہاں سے آئے؟ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ زمرلا اپنے آنوسی بالوں کو اس گندے سے، حقیر سے جال کے ساتھ پیوند کر دے۔۔۔۔۔ سوت کے دام اُونچے سسی، اس کی بساط سے باہر سسی۔۔۔۔۔ لیکن زمرلا کی لہرائی ہوئی پیچیدار زلفوں کی قدر کون پہچانے؟ مایہ گیر کی چندھیائی ہوئی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔۔۔۔۔ اور وہ لڑکھڑایا۔۔۔۔۔ لیکن پھر اس کے دماغ نے ایک کروٹ لی۔ اور اُسے وہ کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں وہ سنا کرتا تھا کہ دنیا میں ایسی سورما عورتیں بھی گزری ہیں، جو ٹوٹی ہوئی کمانوں میں سر کے بال باندھ کر میدان جنگ میں جان کی بازی لگا دیا کرتی تھیں۔۔۔۔۔ مایہ گیر نے اپنی دھندلائی سی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا۔ اور اُسے اپنی زمرلا ایک ویسی ہی شیردل، سورما سپاہی نظر آنے لگی، جو اپنے اُلجھے ہوئے گیسوؤں کا جال بُن کر فاقہ مستیوں کو گرفتار کرنے نکلے ہو!

یہ کوئی پہلا روز نہ تھا کہ زمرلا کے چُو لھے میں آگ نہ سلگتی تھی۔ لیکن اب بڑھے مایہ گیر کو یقین سا ہونے لگا کہ کائنات بھر کی مچھلیاں اس کے جال میں آنے کے لئے بے تاب ہیں۔ وہ پل کی پل میں آس پاس کے شہروں میں مچھلیوں کے انبار لگا دیگا۔ پھر اس کے ٹھنڈے چُو لھے میں بھی آگ جلے گی۔ اس کی ویران جھونپڑی میں پھر دھواں اُٹھے گا۔ اور زمرلا کے سوکھے ہوئے کمزور ہونٹوں میں جان آ جائے گی۔۔۔۔۔ یہ سوچتے سوچتے مایہ گیر نے زمرلا کی طرف دیکھا، تو اس کے خالی پیٹ میں ایک زبردست گھونسہ لگا۔ زمرلا جھکی ہوئی چُو لھے کی راکھ نکال رہی تھی۔ اس کی ساڑھی کا پلو سر سے کھسک گیا تھا۔ بوڑھے مایہ گیر کی آنکھوں میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ اس کی نظر گویا گرم گرم راکھ میں جھلس گئی ہو۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور جال کندھے پر ڈال کر جھونپڑی سے نکل آیا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ بھوک کی تپش سے اس کے سمٹے ہوئے

پیٹ میں آگ سی جل رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ تھی۔ اس کا دل غم اور غصے کے جوار بھائے میں ڈانوا ڈول ہو رہا تھا۔ زمرلا دیر تک جھونپڑی کے دروازے سے لگی ہوئی اپنے بڑھے باپ کو دیکھتی رہی۔ جب وہ دریا کے کنارے پھیلے ہوئے ناریل کے درختوں میں او جھل ہو گیا، تو زمرلا نے اپنی تھکی ہوئی آبدیدہ آنکھیں بند کر لیں۔۔۔۔۔ جیسے پھول کی پتی شبنم کے بوجھ سے جھک جائے۔ وہ دیر تک کھوئی کھوئی سی کھڑی رہی۔ شاید اس کے دماغ میں بھی سنہری مچھلیوں کے خوشگوار خواب تیر رہے تھے۔ شاید وہ بھی اپنے دل میں امید کے موہوم چراغ جلا رہی تھی۔۔۔۔۔ یوں کھڑے کھڑے یکایک اس کو محسوس ہوا، جیسے کوئی سانپ اس کی ٹانگوں میں لپٹا جا رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، تو دیکھا کہ چارو گھٹنوں کے بل جھکا ہوا اپنا سبزا انگوچھا اس کی ٹانگوں کے گرد باندھ رہا ہے! زمرلا کے مرجھائے ہوئے ہونٹ مسکرائے، اور اسے بے اختیار ہنستی آنے لگی جیسے نسیم سحری کا ہلکا سا جھونکا افسردہ پھولوں میں جان سمو دے۔

”دہشت، چارو!“ زمرلا اس کے کندھے پر ہاتھ مار کے بولی۔ ”تو نے تو مجھ کو ڈرا دیا۔“

چارو ہنستا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ مسکراتے وقت اس کے سفید سفید دانت تاروں کی لڑی کی طرح چمک رہے تھے، اور اس کی بڑی بڑی مستانہ آنکھیں لبریز پیمانوں کی طرح چھلک رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ وہ ہمیشہ سے اسی طرح مسکراتے آئے تھے۔ اور ہر روز ایک نیا کیف سا ایک گہرا سرور سا ان کی زندگی پر چھایا جا رہا تھا۔

”میں تو سمجھی کوئی زہریلا سانپ میری ٹانگوں کو جکڑ رہا ہے!“ زمرلا نے ایک پُر اطمینان سانس لے کر کہا۔

چارو کھلکھلا کر ہنسا اور اس نے اپنا سیلا سا انگوچھا پیار سے زمرلا کے گالوں پر مارا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ بھولی لڑکی، تم کیا جانو محبت کی بیڑیاں کس کو

کہتے ہیں!

”تم آج دریا پر نہیں گئے، چارو؟“ نرملانے پوچھا۔

”اونہوں!“ چاڑو مستانہ وار سر ہلا کر بولا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ سارے دریا میں ایک بھی ایسی مچھلی نہیں، جو تمہارے نرم نرم گداز بازوؤں کا مقابلہ کر سکے!

”آج تو دریا چڑھاؤ پر ہے، چارو“ زمرلے نے ناریل کے درختوں کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ”تم کو تو ضرور جانا چاہیے۔“

”اونہوں!“ چارو اسی شریر اندز سے مسکرایا۔ اس کے سانس کی
 بڑھتی ہوئی گرمی کہہ رہی تھی، کہ دل کا جوار بھٹا دریا کے اُتار چڑھاؤ سے کہیں
 زیادہ زور دار ہے!

”جال ٹھیک ہوا، یا نہیں؟“ زلمانے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اونہوں! چارو نے اپنی شریر آنکھیں گھمائیں۔ ”اب وہ جال ٹھیک نہ ہوگا، نزل۔ سوت کے دھاگے کچے جو ہوئے۔۔۔۔۔ اُن پر بھروسہ کون کرے؟“

زِملانے ایک گہری اور لبریز نظر سے اس کو دیکھا۔

چاڑو مسکرایا۔ ”تم مذاق سمجھتی ہو، نرملہ؟ تیری قسم، تیرا وہ جو تیری پلکوں کی کمان سے نکلے۔ اور جال وہ جو تیرے لمبے لمبے، کالے کالے بالوں سے بنے۔“

زِملّا کے دل میں ایک زبردست ٹیس اُٹھی۔ وہ ہوا کی سی تیزی کے ساتھ جھونپڑی میں بھاگ گئی۔ چارو چوکڑیاں بھرتا اس کے پاس پہنچا، اور اس کے شانے جھنجھوڑ کر بولا۔ ”تم شرما گئی ہو، زمل؟ لیکن میری قسم، بولو میں نے جھوٹ کہا ہے؟ میں نے دریا کی مچلتی ہوئی لہروں میں ایک بھی ایسا بھنور نہیں دیکھا، جو تیری بل کھاتی ہوئی کالی زلفوں کا مقابلہ کر سکے۔۔۔۔ مجھے جیون بھرا سی جال میں رہنے دو، زملّا۔ مجھے کچے دھاگوں کے جال پسند نہیں۔ جو یل میں

”ٹوٹیں، یل میں۔۔۔۔۔“

نرملہ کی آنکھوں میں ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس کی گھٹی پلکیں آنسوؤں کے اُڑتے ہوئے پر نالوں پر تھر تھرا رہی تھیں۔۔۔۔۔ چاڑو مسکرایا۔ اس کو یوں نظر آتا تھا جیسے سیلاب کے روز لہروں کا جوار بھانا ماہی گیروں کے جال میں بھنور کھاتا ہوا آئے، اور چھلکتا ہوا نکل جائے!

”تمہیں رونا کیوں آ گیا نہ ملا؟“ اس نے نہ ملا کے کندھے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے کہا۔

باپؤ کو گئے بہت دیر ہو گئی۔ ”نر ملانے بات بتائی۔“ جا کر دیکھو تو کیا بات ہے؟“

”جال ٹوٹ گیا ہوگا!“ چارو زور سے ہنس کر بولا۔ ”اس میں رونا کا ہے
 کا؟ کچے موت کے کچے جال۔۔۔۔۔۔“

چارو کا دبلا پتلا سڈول جسم تیز تیز چلنے میں یوں بل کھاتا تھا جیسے کسی گرتی ہوئی آبشار میں روہو مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ نرملا جھونپڑی کی دیوار سے پیٹھ لگائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک موہوم سا ایک ناقابلِ فہم سا خطرہ لرز رہا تھا۔ وہ دم بھر کے لئے ساری کائنات کو بھول گئی۔۔۔۔۔ ماہی گیروں کی اس چھوٹی سی بستی میں مہینوں سے بھوک اور موت نے چھاؤنی ڈال رکھی تھی۔ پہلے چھوٹے چھوٹے فاقے آئے۔ پھر چٹوڑھوں کی آگ سرد ہونے لگی۔ اور جب ہولے ہولے بوسیدہ جالوں کے تار بھی ٹوٹنے لگے، تو گویا بھوک سے تلملاتی ہوئی روحوں کے بندھن کھل گئے۔ اب کالی کالی گندی جھونپڑیوں کے دروازوں سے کراہتے ہوئے، بلباتے ہوئے، رینگتے ہوئے انسانی ڈھانچوں کی جگہ آزاد روہیں باہر نکلنے لگیں۔ جن کی پرواز کے سامنے زمین اور آسمان کی وسعتیں سمٹ گئی ہوں۔ نرملا جب گلی میں گرے ہوئے بچوں کو سانس توڑتے ہوئے دیکھتی، یا جب وہ جلتی ہوئی چٹاؤں میں سے چڑمڑ چڑمڑ کی بھیانک آواز سنتی، تو اُسے رہ رہ کر اپنے بڑھے باپو کا خیال آتا، جس کی

دھندلائی ہوئی آنکھیں روز روز اندر کو دھنستی جاتی تھیں۔ وہ کھانستہ تو اس کی ابھری ہوئی پسلیاں ٹھس ٹھس بجتیں۔ اور جب وہ پیپل کے پتے نمک کے ساتھ کھا کر اوپر سے پانی کے دو چار گلاس پی جاتا تو اس کے سکزے ہوئے پیٹ کی لٹکی ہوئی جھڑیاں یوں بل کھانے لگتیں جیسے مرے ہوئے سانپ سورج کی گرمی سے تھوڑی دیر کے لئے ریگنے لگیں۔۔۔۔۔ باپو کہا کرتا تھا کہ بیٹی، بڑھاپا تو سوکھے ہوئے دریا کی مچھلی ہے، جو آج نہیں تو کل تڑپ جائے گی۔ لیکن نرملا کی کائنات میں باپو کے سوا اور کیا سہارا تھا؟ وہ سوچتی، اور سوچ کے رہ جاتی۔ رات کے وقت ڈراؤنے خواب اس کی نیند میں ہڈیوں کے ڈھانچے ہی ڈھانچے بکھیر دیتے۔ دن کے وقت اس کا بوڑھا باپ ٹوٹے ہوئے جال کو کندھے پر ڈال ایک زندہ لاش کی طرح گھومتا نظر آتا۔۔۔۔۔ اور اسی سوچ میں جب نرملا نے اپنی لہراتی ہوئی زلفوں کے تار کاٹ کر بڑھے ماہی گیر کا جال سنوار دیا، تو اس کے دل میں خوشی کی لہریں ناچنے لگیں، کہ اب اس کا باپو ریگتی ہوئی، بلبلائی ہوئی موت کے پھندے میں نہ آئے گا۔۔۔۔۔ لیکن!

لیکن اب نرملا کے دل میں ایک موہوم سا ایک ناقابلِ فہم سا خطرہ لرزنے لگا۔ وہ دم بھر کے لئے ساری کائنات کو بھول گئی۔ اپنے بڑھے باپ کو بھی، جس کی ٹیڑھی ٹیڑھی پسلیاں یوں کٹکٹاتی تھیں جیسے سوکھے ہوئے پیڑ کی ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہوں۔۔۔۔۔ نرملا کے دل میں ایک گہرے قسم کا احتاس پشیمانی سر ابھارنے لگا۔ وہ اپنے وحشی اندیشوں کے گرداب میں پھنس کر کانپنے لگی۔ چارو کا ہلکا پھلکا سڈول جسم روہو مچھلی کی طرح بل کھاتا ہوا جارہا تھا۔ نرملا کے دل میں ایک پشیمان سی آواز کہہ رہی تھی، کہ بیوقوف لڑکی! تو نے اپنے ہاتھوں اپنا سنہری جال کاٹ ڈالا۔ اب وہ نکل جائے گا، جیسے دریا کی مچھلی ٹوٹے ہوئے جال کے شگاف سے پھسل جاتی ہے۔ اور پھر وہ زندگی کے اتھاہ سمندر میں ایسا کھو جائے گا، ایسا کھو جائیگا۔۔۔۔۔۔۔ نرملا کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکلنے لگیں۔ اسے اپنے بڑھے باپ پر غصہ آنے لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ باپو کے

ہاتھ سے جال چھین کر تار تار کر ڈالے۔ اور اپنے بالوں کی رسیوں کو اس سبک خرام روہو کی کمر میں ایسے ڈال دے کہ وہ کبھی پھسل نہ سکے، کبھی منتشر نہ ہو۔۔۔۔۔

چارو تیز تیز جا رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں ایک آنچ سی تھی۔ ایک بے کیف، بے شرار سی آگ جو بغیر ایندھن کے چٹوٹھے میں سلگ رہی ہو۔ لیکن جب اُسے نرملا کا خیال آتا، تو وہ آگ گویا بجھ سی جاتی، اور اس کی زندگی پر ایک ہلکا سا سکون چھا جاتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لہروں کا شباب زوروں پر تھا۔ پانی کے اونچے اونچے ریلے آتے اور ساحل کی دیواروں سے ٹکرا کر منتشر ہو جاتے۔ موجوں کے تھپیڑے چھلک چھلک کر اٹھیلیوں کا ساز بجا رہے تھے، اور ماہی گیروں کی ہلکی پھلکی نوکیلی کشتیاں لہروں کے تلاطم میں یوں جا رہی تھیں، جیسے پانچویں رات کا چاند بھورے بھورے بادلوں کے درمیان بھاگا جا رہا ہو۔۔۔۔۔ لیکن چارو نے سوچا، کہ یہ تیکھی تیکھی کشتیاں تو نرملا کی پلکوں کی طرح ہیں، جو تھلکتے آنسوؤں پر ڈمگ رہی ہوں! اس کا جی چاہا کہ وہ نرملا کے گالوں پر زور سے چٹکی بھرے اور اس کو ایک بار پھر مڑا دے۔۔۔۔۔ سیلاب، کشتیاں، جال! وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ اور پھر ہاتھ اٹھا کر اس نے ہوا میں ایک طویل اور بلند بوسہ لے لیا!

آسمان پر ایک میلا سا چاند ابھرا ہوا تھا۔ بڑھتی ہوئی شام کے ستارے میں دریا کے تھپیڑے اور بھی بلند ہو رہے تھے۔ بڑھا ماہی گیر کنارے پر کھڑا ہوا جال کھینچ رہا تھا۔

”کھو چاچا، آج تو بورے بھر لئے تم نے؟“ چارو نے پاس آ کر پوچھا۔
بڑھے ماہی گیر کے دانت اس کی پسلیوں کی طرح کٹکٹائے۔ اور اس نے خالی جال اٹھا کر چارو کے سامنے پھینک دیا۔ نرملا کے بالوں کے پیوند اُلجھ اُلجھ کر گچھے سے بن گئے تھے، اور ان کی لپیٹ میں صرف دو ننھی ننھی مچھلیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔

”یہ کیا لے آئے چچا؟“ چاڑو نے جال میں اُلجھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر پوچھا۔ ”جالوں کے بال، یا بالوں کے جال؟“ چاڑو ہنسا۔
ماہی گیر نے بتایا۔

ماہی گیر کچھ نہ سمجھا۔ اسے چارڑ کی مہمل سی باتوں پر غصہ آرہا تھا۔

چارو دل ہی دل میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ بالوں کے جال! پلکوں کی کشتیاں!!! آنسوؤں کا سیلاب!!!۔۔۔۔۔ اور پھر اس نے جال میں اُبھی ہوئی کالی زلفوں کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر چوم لیا!

وہ تھی تو سانولی سی، سادہ سی، معمولی سی، لیکن اس کے جسم میں جوانی کا تناؤ تھا۔ سول لائن کے حلقوں میں مسٹر رام لال کی آیا کا چرچا تھا۔ سرشام جب وہ پریسبویٹر میں رام لال کے بچے کو بٹھا کے نکلتی تھی تو سول لائن کے افق پر گویا چاندنی سی چھا جاتی تھی۔ وہ بھی اپنے بدن کی مقناطیسی قوت سے بے خبر نہ تھی۔ وہ اپنے بالوں میں بنگال کیمیکلز کا مشک بو کو کونٹ ہیر آئیل ڈال کے کنگھی چوٹی سے آراستہ ہو کر نکلتی تھی۔ ماتھے پر بندی۔ ہونٹوں پر مسز رام کی سنگار میز سے چرائے ہوئے لپ سٹک کی دھڑی۔ ناخنوں پر عتابی پالش۔ گردن میں خم، چھاتی میں ابھار۔ گالوں پر پاؤڈر۔ آنکھوں میں لگاؤٹ۔ کوٹھیوں کے خاناماں باورچی خانے چھوڑ کر اس سے راز کی ایک بات کہنے سڑک پر آ جاتے تھے۔ مہتر کموڈ کے پاٹ جھاڑیوں کے پیچھے چھپا کر اس سے نیاز حاصل کرنے کی تلاش میں منڈلاتے رہتے تھے۔ سفید براق وردیوں میں ملبوس بیڑے جیبوں میں بسکٹ اور دل میں ارمان دبائے اپنی دیوی کا انتظار کرتے تھے۔ چمکیلی کاروں میں فراٹے بھرتے ہوئے دیدہ زیب، خوش لباس، دل پھینک بوڑھے اور جوان بھی اسے گھورے بغیر آگے نہ بڑھتے تھے۔ سول لائن کی کالی اور گوری میمیں اس سے جلتی تھیں۔ کالے اور گورے صاحب اس پر مرتے تھے اور ایک سانولی سی، سادہ سی، معمولی سی آیا نے آراستہ بنگلوں اور پیراستہ کوٹھیوں کی اس دنیا پر رومان کی قوس قزح بٹن دی تھی!

۴ نمبر کی کوٹھی میں مسٹر رام لال رہتے تھے۔ ۸ نمبر میں مسٹر رام ناتھ ۱۲ میں خان بہادر یوسف ۱۳ میں مسٹر چیٹر جی ۱۸ میں مسٹر نواب۔ باقی کوٹھیوں میں بھی انسان ہی آباد تھے۔ لیکن ان کی بیویاں بد صورت تھیں یا پردے میں۔ ان کی بیٹیاں شاید ابھی جوان نہ ہوئی تھیں۔ ان کے خاندان روزے رکھتے تھے یا مندر جاتے تھے۔ ان کے مرد شراب پینے سے ہچکچاتے تھے۔ ان کی عورتیں غیر مرد کے سائے سے بھی ڈرتی تھیں۔ سول لائن میں انکا وجود یوں تھا جیسے زعفران کے کھیت میں سرسوں یا شراب کے پیالے میں جوشاندہ، یا سیخ کے خستہ کبابوں میں ہڈی کے ٹکڑے! یہ کوٹھیاں سول لائن میں گم گشتہ مزاروں کی طرح آباد تھیں۔ جن پر نہ کوئی پھول چڑھاتا ہے نہ چراغ جلاتا ہے۔ نہ دل تھام کے دو کلمے دعا ہی کے ادا کرتا ہے۔ ان کوٹھیوں میں خانسماؤں کو باورچی کہتے ہیں۔ بیروں کو خدمت گار اور بیویوں کے ساتھ شادی کرنے کا رواج تھا۔ رات کے وقت یہاں بھی رومان کے فرشتے اترتے تھے لیکن ان کے نغموں کی صدائے بازگشت عموماً ایک نئے ننھے کی ریں ریں روں روں میں منتقل ہو جاتی تھی! ان خاندانوں میں خدا کی ذات پر ایک معصوم سا ایمان تھا۔ کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی روزی بھی ساتھ لاتا ہے۔ لیکن وہ یہ فراموش کر دیتے تھے کہ خدا کی سلطنت میں بھی ڈاکو آباد ہیں۔ جو رنگ بھی چراتے ہیں، بھنگ بھی چراتے ہیں اور گندم کی سنہری خوشے بھی! جس کی لالٹھی اسکی بھینس۔ فرق تو سفید اور کالے تلوں کی قیمت میں بھی ہے پر انسان کی رنگت میں امتیاز کیوں نہ ہو۔ کوٹھور، کی دلالی میں منہ کالا۔ جس کی رنگت سفید ہو وہ کوٹے کی کان میں جائے ہی کیوں؟ درد کا حد سے گزرتا ہے دوا ہو جانا! کوٹہ جب حد سے کالا ہوتا ہے، تو ہیرا بن جاتا ہے۔ کشش تو ہیرے کی ہے، کوٹے کی نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوٹے کی کانوں میں زہریلی گیسیں بھی ہوتی ہیں۔ ان میں حادثے بھی ہوتے ہیں۔ وہ پھٹ بھی جاتی ہیں اور جب وہ پھٹتی ہیں تو زمین کی تہ میں سوئے ہوئے مردہ کیڑے بھی ایک بار کروٹ لیتے ہیں!

مسٹر رام لال کی آیا، آیا تھی تو کیا ہوا؟ عورت تو تھی۔ جوان تو تھی۔ خوبصورت تو تھی یوں کہنے کو عورت تو رام لال کی بیوی بھی تھی۔ جوان تو خان بہادر کی لڑکی بھی تھی۔ خوبصورت تو چیٹر جی کی بیوہ بھی تھی، لیکن خالی عورت ہونے اور جوان ہونے اور حسین ہونے سے تو کائنات کی کنجی ہاتھ میں نہیں آجاتی!

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

یہ ایک تھام لینے کا گر تھا جو آیا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پگھلے ہوئے جذبات کی بدرو میں بہتے ہوئے پانی کی طرح بہہ جانے نہ دیتی تھی۔ وہ ایک آرٹسٹ تھی۔ فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے عکس کو زندگی سے بھی خوشنما اور رنگین بنا کے دکھائے۔ آیا کا کمال یہ تھا کہ وہ عورت ہوتے ہوئے بھی عورت سے زیادہ پُرکشش تھی، خانسماؤں، بیروں، مہتروں کی بات دوسری تھی۔ وہ اپنی چڑچڑی، تھکن آلود، زرد رو بیویوں سے اکتا کر ایک ایسی دنیا میں پناہ لیتے تھے جہاں تصور ہی تصور میں وہ بنگلوں میں بسنے والی دودھ کی طرح گوری، بالائی کی طرح نرم اور ریشم کی طرح نازک عورتوں کو اپنی بانہوں کے درمیان جھنجھوڑ دیتے تھے۔ مسٹر چیٹر جی کا خانساں رمضان دل ہی دل میں اپنے مالک کی بیوی سے عشق لڑاتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ مسز چیٹر جی کے چمچوں، پیالوں اور گلاسوں کو اپنی زبان سے چاٹ کر تر کر دیتا تھا۔ جب مسز چیٹر جی اپنے چمچوں سے پڈنگ کھاتی تھی، یا پیالوں سے چائے پیتی تھی، یا بلور کے رنگین گلاس سے شیری کا پیگ نوش کرتی تھی، تو رمضان خانساں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ مسز چیٹر جی کے عنابی ہونٹوں کو چٹا چٹا چوم رہا ہے!

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا! رام پر تاب مہتر نے ایک دوسری طرح اپنی تنگی داماں کا علاج تلاش کر لیا تھا۔ وہ خان بہادر یوسف کے گھر کا بھنگی تھا۔ سولہ روپے ماہوار میں اسے تین غسل خانوں کا کام سمیٹنا پڑتا

تھا۔ خان بہادر اور بیگم کے غسل خانوں میں جاتے ہوئے اُسے گھن آتی تھی۔
 بیر اور دسکی کے پس خوردہ بکارات، ذیابیطس کے ایلپیومن کی بدبو۔ کرچن
 سالٹ کے فیض کا رد عمل۔۔۔۔۔ وہ اس غیر طبعی ماحول کی عفونت سے گھبرا اٹھتا
 تھا۔ لیکن نعمت آراء کے غسل خانے میں جاتے ہی اس کے دل کی دنیا ممک
 اٹھتی تھی۔ نعمت آراء خان بہادر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پتے ہوئے آڑو کی طرح
 جوان۔ رام پر تاب کو نعمت آراء کے غسل خانے کی فضا میں گلاب اور چمپا اور
 موتے کی سوندھی سوندھی خوشبو کا لطف آتا تھا۔ وہ بار بار ڈر کر صابن کی گیلی
 نکلیا کو چھوتا تھا اور شرماتا تھا کیونکہ کہ وہ نعمت آراء کے مشکبوتن بدن کی
 آشنائے راز تھی۔ تولنے کی نرم نرم، تازہ تازہ نم آلودگی، اتارے ہوئے کپڑوں
 میں سلگتی سی آنچ کا احساس، نہانے کے ٹب میں پانی کے بلبلوں کی آنکھ میں
 سرور رفتہ کا خمار۔ رام پر تاب مہتر غسل خانے کی چٹنیاں اندر سے بند کر کے
 نعمت آراء کے ٹب میں بیٹھ جاتا تھا۔ نعمت آراء کا گیلیا صابن اس کی کالی کالی
 کھردری جلد کو اپنی ریشمیں اور مشکبار جھاگ کے غبار میں چھپا لیتا تھا اور جس
 طرح مقناطیس کی رگڑ لوہے کے ٹکڑے میں بھی کشش پیدا کر دیتی ہے۔ اسی
 طرح نعمت آراء کے تولنے کی رگڑ بھی رام پر تاب کے نحیف اور خمیدہ بدن میں
 پتے ہوئے آڑوں کا رس بھر دیتی تھی۔ غسل خانے کی کھڑکیاں اور دروازے
 بند کر کے وہ تصور ہی تصور میں اپنے روئیں روئیں کو نعمت آراء کے مرمریں
 وجود سے آباد کر لیتا تھا۔ ایسے وقت اس میں اتنی ہمت بھی ہوتی تھی کہ وہ
 مونچھوں پر تاؤ دے کر روز محمد ذرا یور کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے اور اپنی
 چھاتی کی ایک ٹکڑے سے پچھاڑ کے رکھ دے!

روز محمد بڑا چابک دست ذرا یور تھا۔ وہ بہت سی نازک اندام حسیناؤں
 کو پہلو میں بٹھا کر موٹر چلانا سکھا چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر اچھی سے اچھی کار
 کے کل پرزے بھی جھنجھٹا اٹھتے تھے۔ انجن کی رفتار خوفناک طور پر تیز ہو جاتی
 تھی اور خوف و ہراس، بیم ورجا اور بے بسی کے اس عالم میں روز محمد کے

مضبوط بازو سے ہوئے حسن کا سہارا بن جاتے تھے! عورتوں کے جسم پر بھی
 روز محمد ایک ہوشیار ذرا یور کی طرح چچی تلی نظر ڈالتا تھا۔ چنانچہ اس نے
 دیکھی سنی، جان پہچان کی عورتوں کے نام بھی کاروں کے موڈل اور ان کی
 ساخت پر موزوں کئے ہوئے تھے۔ بیگم یوسف فورڈ ۱۹۳۸ تھی۔ مسز رام لال
 ماسٹر بیوک۔ مسٹر چیتر جی کی بیوہ بہو سیکنڈ ہینڈ ٹورو۔ رائے صاحب کی کیم و سٹیم
 بیوی ہمبر کا کشادہ سیلون۔ کسی کو وہ ٹو میٹر کہتا تھا۔ کسی کو ریس کار۔ کسی کو بے
 بی آسن۔ اور آیا کا نام اس نے ٹیکسی رکھا ہوا تھا۔ سیٹی بجائی اور حاضر۔ میٹر
 کے حساب سے آٹھ آنہ فی میل کرایہ ہالٹ کا سوا روپیہ گھنٹہ۔ کبھی کبھار روپیہ
 آٹھ آنہ کی بخشش۔ دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں جن کے پاس بیش قیمت گراں
 بہا کاریں ہیں۔ لیکن وقت بے وقت ان کو بھی ٹیکسی پر چڑھنا ہی پڑتا ہے۔ خیر۔
 روز محمد کا فلسفہ تھا کہ دنیا میں صرف موٹر ہی نہیں چلائی جاتی، عورت بھی چلائی
 جاتی ہے۔ فقط چلانے کا سلیقہ چاہیے اور چلنے کا بھی!

رات کے گیارہ بارہ بجے جب سول لائن کی دنیا پر گناہ و ثواب کے
 چنگبرے سائے چھا جاتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے دو جلسے بلا ناغہ منعقد
 ہوتے تھے۔ مردوں کی مجلس روز محمد کی کوٹھڑی میں ہمتی تھی! اس میں
 خانساواؤں اور بیروں، مسالچیوں، مہتروں اور ذرا یوروں کی برادری کے ارکان
 شریک ہوتے تھے۔ وہ خیال کی آنکھوں دیکھی اور دل کے کانوں سنی کہانیاں
 بیان کر کے روز محمد کی کوٹھڑی میں رومان کا ماحول کھڑا کر دیتے تھے۔ ایک
 خانساواں سناتا تھا کہ اس کے بنائے ہوئے شامی لبابوں پر عنابی ہونٹوں کا ایک،
 جوڑا بے طرح جھپٹا۔ ایک بیڑا کہتا تھا۔ کہ کاک ٹیل کا جام بڑھاتے بڑھاتے
 اس کے ہاتھوں نے کسی کی مخروطی انگلیوں کو چوم کر رکھ دیا ایک مسالچی کہتا
 تھا۔ کہ مصالحہ پیستے ہوئے اس نے پانی کی بجائے اپنی دہن کا لعاب ملا دیا۔
 دزویدہ محبت اور رومان کے یہ قفے روز محمد کے کمرے کی فضا کو معطر کر دیتے
 تھے لیکن پھر رام پر تاب مہتر اس رنگین ماحول میں گندے اندے کی طرح

آپکتا تھا، عنابی ہونٹوں، مخروطی انگلیوں اور لذیذ گالوں کے ذکر میں وہ نعمت آرا کے کموڈ کا قصہ لے بیٹھتا تھا۔ لیکن اس قصے میں بھی رس ہوتا تھا اور خانساؤں بیروں، مہتروں، مسالچیوں کی یہ برادری باورچی خانوں سے لے کر پائخانوں تک کی چار دیواری میں اپنی جنتِ گمشدہ کا سراغ پالیتی تھی۔

آیاؤں کی محفل میں رومانی قصے چلتے تھے وہ سر سے سر جوڑ کر رموزِ خودی اور اسرارِ بے خودی کی تفسیر گردانتی تھیں۔ وہ تو اپنی کوٹھیوں کے خلوت اور جلوت خانوں کی آشنائے راز تھیں۔ پرورشِ انسانی میں ان کا درجہ گویا ماں کا درجہ تھا۔ ان کے پاس جسم اور روح کی بالیدگی کے انوکھے گرتھے۔ سنسارِ مالا کی طرح ان کی آغوش سب کے لئے وا تھی۔ بچے تو سکون پا کر ان کی چھاتی پر سو جاتے تھے۔ لیکن جوان اور بوڑھے اپنی ماؤں کو پہچاننے سے قاصر تھے۔ آیائیں مسکراتی تھیں کہ چلو بیٹے خوش تو ہیں! چنیں ہوا تو کیا، چناں ہوا تو کیا! یوں بھی زندگی عزیز کی خاطر انہیں سو طرح کے ڈھنگ رچانے پڑتے تھے۔ زبان کے چٹارے کے لئے خانساؤں کی خوشامد نئے کپڑوں کے لئے دھوبیوں کی منت۔ نئے دو نئے کی ضرورت کے لئے مہتروں، مسالچیوں اور بیروں کی سماجت، نوکروں کے لئے تو خیر ان کا وجود من و سلوئی سے کم نہ تھا۔ لیکن اپنے مالکوں کے لئے بھی وہ نعمت خانے کا ضروری جزو تھیں جنہیں وہ وقت بے وقت ذائقہ بدلنے کے لئے نوش فرمایا کرتے تھے۔ اس پر بھی شکوہ یہ تھا کہ آیائیں آوارہ ہیں! حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

ایک دن روز محمد کار دھونے تالاب پر گیا تو اس کی نظر آیا پر پڑی۔ وہ نیلے کنارے والی سفید دھوتی بے پردائی سے بدن پر لپیٹے بیٹھی بال سکھا رہی تھی۔ آیا کو دیکھ کر روز محمد ہارن بجا بجا کر ساون کے نظارے ہیں، گانے لگا آیا نے اپنے ہونٹ دانتوں میں بھیج کر اسے غصہ سے گھورا۔

روز محمد اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ”ہائے میری لاڈو۔ تیرے فیشن پر اللہ کی مار۔ میں کہتا ہوں گوری، نمونیہ سے مرجائے گی تو جب دیکھو تالاب پر

نہا رہی ہے۔ مجھے بتا تو سہی کیا ارادہ ہے تیرا؟“
”چل، روجم“ آیا روز محمد کو روجم کہا کرتی تھی۔ ”تو نے تو مذاق بنا رکھا ہے مجھے تو کسی فیشن کی لت نہیں اپنی ضرورت سے سردھوتی ہوں۔ تم کیا جانو۔“

روز محمد نے ایک مشاق نظر آیا کے تن بدن پر دوڑائی۔ جیسے وہ موٹر کار کا ٹائر جانچ رہا ہو کہ ہوا پوری ہے یا کم۔ آیا نے شرما کر دھوتی کا پلو کمر پر اچھی طرح لپیٹ لیا۔ روز محمد آنکھوں کے گوشے سمیٹ کر مسکرایا۔
”آخر آگئی نارپوڑی کے پھیر میں! کتنی بار کہا تھا کہ سنبھل کے چل۔ لیکن تجھ پر تو جوانی کا بھوت چڑھا ہوا تھا۔ اب بول کس سالے کو باپ بتائے گی؟“

”باپ بتائے گی میری جوتی“ آیا نے تنک کر کہا۔ ”میں تو اس کی ماں ہوں گی اسے باپ کی کیا پروا؟“

اری چپ رہ۔ تو نہیں جانتی سالے کو ٹھیوں والوں کو تجھے کان سے پکڑ کے نکال دیں گے۔ سور کے جنے گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز۔ چل تجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ جو سو پچاس خرچ آئیں گے میں دوں گا۔ تیری نوکری تو رہیگی میری لاڈو۔“ روز محمد بھی یاروں کا یار تھا۔ ڈرا یوروں کی منڈی میں اسے نخی لیرا کہا کرتے تھے۔

دم بھر میں آیا نے ساری کائنات کا جائزہ لے لیا اس نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی۔ اپنی نوکری کا آگاہیچھا سوچا اور دنیا بھر کے بچے پالنے والی ماں کو خود اپنے بچے سے فرار کی کوئی دوسری راہ نظر نہ آئی۔ اگلی صبح جب روز محمد کار دھونے کے لئے گیا، تو تالاب میں آیا کی لاش تیر رہی تھی۔۔۔۔۔ اب اسے ڈھونڈ چرائیخِ زیبائے کر۔

اس کے قریب آتا جائے گا، چھاؤں بکھیرنے والے ابر پارے اس سے دور ہوتے جائیں گے۔ مجھے اس کا تجربہ ہے۔ میں نے کہا۔ ”گوراں تم میری منزل ہو۔ مجھے اپنی منزل تک آنے دو۔“ گوراں نے کہا۔ ”آجاؤ! میں بھی اپنی منزل کے لئے بھٹک رہی ہوں۔“ جوں جوں میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا۔ میری منزل مجھ سے دور ہوتی گئی جیسے سراب کی طرف بھاگنے والا پیاسا مسافر بھاگتا جائے، بھاگتا جائے اور انجام کار پانی کی ٹھنڈی لہروں کی جگہ ریت کے گرم گرم تودوں میں اٹک کے رہ جائے۔ میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا، بڑھتا گیا، اور جب میں نے گوراں کو قریب قریب پالیا تو وہ گوراں نہ تھی۔ وہ اس کا جسم تھا۔ خوبصورت۔ مرمیس۔ ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا۔ جھنجھٹا ہوا جسم عورت کی کائنات اس کا جسم ہی تو ہے۔ شاید گوراں کا مرمیس بدن سڑک کے اگلے موڑ پر بک گیا ہو۔ بکنے دو مجھے ہمدردی کا احساس بھی کیوں ہو؟ وہ اپنے خوبصورت جسم کی مالک ہے۔ بالکل مختار جیسے مجھے اپنے کوٹ پر اختیار ہے۔۔۔۔۔

ظہیر میری باتوں پر ہنستا ہے۔ وہ میرا پڑانا یار ہے۔ ہم برسوں ہم جماعت رہے تھے۔ اب قسمت کی ستم ظریفی نے ہم دونوں کو ایک ہی دفتر میں اکٹھا کر دیا ہے۔ میں ساڑھے بارہ سو پاتا ہوں۔ ظہیر کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہے۔ جب ہم کہیں اکیلے ہوتے ہیں تو وہ بے تکلفی سے میرے سر پر چائنا مار کے گرجنے لگتا ہے ”ابے او صاحب کے بچے! تم روز بروز سڑی ہوتے جا رہے ہو۔ تلاش۔ فرار۔ فلسفہ۔۔۔۔۔ میں کہتا ہوں سب بکواس ہے۔ تم کیا جانو عورت کس چیز کا نام ہے؟ میری طرف دیکھو۔ جب میری جیب میں ساڑھے پانچ آنے کے پیسے ہوتے ہیں، تو میں صبح سویرے سیدھا علم دین سبزی والے کی دکان پر پہنچتا ہوں۔ آدھ سیر پالک لیتا ہوں، ڈیڑھ پاؤ، آلو، دو پیسے کے نمائز۔۔۔۔۔ اور کسی کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ مجھے سبزی خریدنے کا ڈھنگ نہیں آتا! لیکن اگر کسی روز کوئی حرامزادہ ضرورت سے زیادہ مٹی گرم کر دے، اور

تلاش

مایوس، غمیدہ، بیزار۔۔۔۔۔ گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے جانے دو۔ اس کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ جس طرح میرا کوٹ میرا اپنا کوٹ ہے میں اس کوٹ کو سنبھال کر رکھوں یا پھاڑ ڈالوں۔ خود پنوں یا بیچ دوں، یا کسی راہگیر کی جھولی میں ڈال دوں۔۔۔۔۔ مجھے کون روک سکتا ہے؟ میں اپنے کوٹ کا مالک ہوں۔ گوراں اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گذرتا ہوا راہرو اسے خرید لے گا۔ خریدنے دو۔ مجھے پشیمانی کا احساس بھی کیوں ہو؟ دنیا کا نظام کاروباری لین دین پر تو قائم ہے اور پھر گوراں کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اور جس قیمت پر چاہے اسے بیچ دے۔ اپنی چیز ہے۔ اپنی چیز پر سب قادر ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس میں ٹانگ کیوں اڑائے خواہ مخواہ۔

سڑک پر بجلی کے کھمبوں کے نیچے روشنی کے بڑے بڑے دھبے ہیں۔ کھمبوں کے درمیان سنان اندھیرا ہے۔ گوراں کی زندگی میں بھی تاریک اور اُبلے سائے ہیں۔ وہ سڑک کے کالے اور سفید دھبوں کی طرح ساکن اور منجمد نہیں۔ زندگی کے سائے چلتے پھرتے نشان ہیں۔ تہمتاے ہوئے سورج کے سامنے آورہ بدلیاں آجائیں تو زمین پر ایک محدود ساسیہ چھا جاتا ہے۔ تھکا ہوا مسافر بے قراری سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ بیوقوف آدمی! جوں جوں وہ ساسیہ

میری جیب میں دو ایک روپے کھنکتے ہوں، تو میں سبزی منڈی میں جا کر لٹک جاتا ہوں اور دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ علم دین کی دکان بھی کوئی دکان ہے بھلا؟ باسی مال، سڑے ہوئے پتے، گندی ٹوکریاں۔ میں پر بھدیاں کی دکان میں جھانکتا ہوں۔ کرتار سنگھ کے خوبصورت شال کا جائزہ لیتا ہوں اور دل ہی دل میں گو بھی، مٹر، چقندر، سلاڈ اور انناس کے وٹامنز اے، بی، سی کا تجزیہ کرتا ہوں۔ لیکن حساب ٹھیک نہیں جمتا۔ کبھی وٹامنز کے اجزاء میرے دو روپوں سے آگے نکل جاتے ہیں کبھی میرے دو روپے وٹامنز کی قیمت پر بھاری نظر آتے ہیں۔ اسی دھیڑ بن میں ساڑھے دس بج جاتے ہیں۔ میں جلدی جلدی کسی چھاڑی والے سے گلی سڑی سبزی ٹکوا کر بھاگم بھاگ واپس آتا ہوں۔ بیوی ناک بھوں چڑھاتی ہے۔ میں خالی پیٹ دفتر جاتا ہوں اور وہ حرامزادہ آفس سپرنٹنڈنٹ میرے لیٹ آنے پر آنکھیں نکالتا ہے۔۔۔ کیا سمجھے بیٹا؟ میرے چالیس روپوں پر دو لڑکیوں کے باپ ریتھے۔ میں نے ایک کو پھانس لیا۔ تمہارے ساڑھے بارہ سو پر بہت سی لڑکیاں اور ان کی مائیں بھنبھنا رہی ہیں۔ دو ایک کو پھانسو اور عیش کرو۔۔۔۔۔ ورنہ لٹکتے رہو گے بچہ۔ جس طرح میں کرتار سنگھ کے شال پر لٹک جاتا ہوں۔۔۔۔۔

ظہیر کی زبان پر عورت کا نام ایک لذیذ چٹخارے کی صورت میں آتا ہے کالج کے دنوں میں اسے چاٹ کا شوق تھا۔ جب کبھی وہ املی کے پانی سے بھرے ہوئے گول گپنے منہ میں ڈالتا تھا، اس کے ہونٹوں سے چار چار انگل لمبی رال ٹپک پڑتی تھی۔ اور وہ کسی خاموش لذت سے بلبلا اٹھتا تھا۔ ”ہائے ہائے“ کیا خستہ گول گپتا ہے۔۔۔۔۔ جیسے مس کلیانی کے لال لال ہونٹ پگھل رہے ہوں!“ چاٹ کے ہر تازہ لقمے کے ساتھ وہ اپنے کالج کی لڑکیوں کا کوئی نہ کوئی حسین حصّہ نگل جاتا تھا! مس کلیانی کے ہونٹ، خالدہ کے دہکتے ہوئے گال، زرینہ کی حنائی انگلیاں۔۔۔۔۔

ظہیر کہتا ہے ”عورت شہد کی مکھی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بے

کار چھتے میں رس بھرتی ہے۔ اس کے زہریلے ڈنک پر نہ جاؤ۔ اس کی رسیلے مٹھاس دیکھو۔ تم نے نیلما کو دیکھا ہے؟ اندر سین ڈسٹھیر کی خوبصورت بیوی۔ وہ پاجی اسی دفتر میں گنٹام سا اُمیدوار تھا لیکن نیلما کی رعنائیوں نے دفتر کی شاہراہ پر رنگین جال بچھا دیئے۔ آفس کا ایک دل پھینک ناخدا زیر دام آگیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اندر سین چوہیں اُمیدواروں کے اوپر سے پھلانگتا ہوا ڈسٹھیری کی کرسی سنبھال بیٹھا۔۔۔۔۔ ہائے عورت کی نگاہ! میرے بھائی، اس کی نگاہ سے زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔ تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ نگاہ مرد مومن کی تلاش کون کرے۔ ذوق یقین کا سودائی کون بنے۔ دنیا ہے تو عورت کی گود میں۔ عجبے ہے تو اس کی مسکراہٹ میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب اندر سین ہیڈ کلر کی کے خواب دیکھ رہا ہے، نیلما کی بلوری گردن میں اب پھر لطیف خم پیدا ہو رہے ہیں۔ خدا کی قسم تم اس سنہری گرداب میں بے تکلف کود جاؤ۔۔۔۔۔ ایک بچاری ہیڈ کلر کی کیا چیز ہے، تم میری مانو تو اس مرمریں گردن کے ایک حلقے پر دفتر کی ساری کائنات اندر سین کو سوئپ دو۔۔۔۔۔ ہائے کیا لوچ ہے ظالم کی گردن میں۔۔۔۔۔ جیسے عمر خیام کی رباعی تھرک تھرک کرناچ رہی ہو۔۔۔۔۔

ظہیر میں ایک یہی بڑا عیب ہے۔ وہ عورت میں عورت کو نہیں دیکھتا۔ وہ عورت میں اس کا جسم ٹوٹتا ہے اور پھر جسم میں بلوری گردنوں، ناچتی ہوئی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے سینوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اسی پر بس نہیں۔ وہ جسم کی ہر رعنائی، حصن کے ہر بیج، سینے کے ہر نشیب و فراز کو بیوپاری نظر سے ناپ تول کے ان پر قیمتوں کے لیبل لگا دیتا ہے۔ نیلما کے گردن کے خم کی قیمت میرے دفتر کی ہیڈ کلر کی ہے۔ صادقہ اس کی بیوی ہے لیکن ظہیر کہتا ہے۔ کہ صادقہ کی گھنی اور گھنگھریالی زلفوں کی قیمت چالیس روپے ماہوار ہے۔ چنانچہ پہلی تاریخ کو وہ اپنی ساری تنخواہ صادقہ کی جھولی میں دال دیتا ہے۔ جب کبھی دفتر میں اس کی مٹھی معمول سے زیادہ گرم ہو جائے تو وہ اپنا غبار ہلکا کرنے کے لئے جھمی جان یا گلزار بیگم یا رتنابائی کے کوٹھے میں پناہ لیتا ہے۔ جھمی جان، تین

روپے۔۔۔۔۔ گلزار بیگم، پانچ روپے۔ رتنا بائی، دس روپے، کیونکہ اس کے بائیں گال پر ایک ننھا سا تل ہے اور اس کے عنابی ہونٹوں میں پکے ہوئے انگوروں کا رس چھلکتا ہے۔ ایک دن وہ گوراں کے چوبارے میں گیا۔ اس کی جیب آسودہ تھی۔ اس نے ایک ایک روپے کے بیس نوٹ گوراں کے سامنے بچھا دیئے۔

گوراں نے کہا۔ ”آپ یہ نوٹ اپنے ہی پاس رکھیں۔ آپ میری قیمت نہیں دے سکتے۔“

ظہیر نے سوچا، وہ بن رہی ہے۔ اس نے گوراں کو اسی قیمت پر چکایا تھا۔ اس نے اپنا بٹہ نکال کر ہوا میں اچھالا اور فخر سے بولا۔ ”ماگو کیا مانگتی ہو جانِ تمنا آج تمہارا ظہیر خوشحال ہے۔“

گوراں نے ایک تھکی ہوئی انگڑائی لی۔ ”ظہیر صاحب، میں روز روپیہ کماتی ہوں۔ آپ روز روپیہ لٹاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آج ایک لمحہ لے لئے آپ مجھے گوراں نہ سمجھیں۔ ایک عورت سمجھیں۔۔۔۔۔ ایک لمحہ کیلئے آپ گاہک نہ بنیں، ایک مرد بن جائیں۔ بس یہ دو بے لوث لمحے میری حیات کو جاوید کر دیں گے۔“

ظہیر ہنسنے لگا۔ وہ اُلو کا پٹھا کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ گوراں کے کھوئے کھوئے اضطراب کو سراہتا تھا۔ اُس نے زبردستی اسے بیس روپے دیدیئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ازل سے گوراں کی تعمیر میرے لئے ہوئی تھی۔ کائنات میں اس کا وجود میرے وجود کا عکس تھا۔ لیکن جب ہم نے تو ہمارے درمیان ایک وسیع اور بھیانک خلاء منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ وہ اپنے چھبیسویں سال میں ہے۔ پچھلے تیرہ برس سے وہ ہر روز بکری کے گوشت کی طرح ترازو میں تل تل کر بکتی رہی ہے۔ سینکڑوں ہزاروں انسان اپنی ہشتاپشت کی کچڑ اس پر اچھال چکے ہیں۔ بنی نوع انسان کی صدیوں کا سیاہ کار زہر گوراں کی رگ رگ میں سمویا ہوا ہے۔ ایک قاتل بیماری کے انگارے اس کے خون میں چنک رہے ہیں۔ اس کی گلاب کی پتیوں جیسی ملائم اور مشکبار جلد کے نیچے بڑے

بڑے گھاؤ ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہے کہ محبت کے دو بے لوث لمحے، اس کی حیات کو جاوید کر دیں گے!۔۔۔۔۔ میں نے کہا، گوراں! اگر تو کائنات کے آخری کنارے پر بھی ہوتی، تو میں ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر تیرے پاس پہنچ جاتا! اس کا جسم بے داغ جسم نہیں۔ اس کا جسم پامال جسم ہے۔ پھول کی طرح پامال نہیں جو پاؤں کے ایک ہی دباؤ سے ٹوٹ کر مر جھا جاتا ہے۔۔۔۔۔ بلکہ سڑک کی طرح، جس کی چھاتی پر بھک بھک کرتا ہوا سٹیم رولر ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر ریتلٹا جائے۔۔۔۔۔ پیدل چلنے والے جوتیاں چٹختے گزرتے جائیں۔ ٹم ٹم اور ٹانگے جچ جچ کرتے نکلتے جائیں۔ موٹریں گرد اڑاتی بھاگتی جائیں۔۔۔۔۔ سڑک گھمتی جائے۔ پتھر ٹوٹتے جائیں لیکن گزرنے والے گزرتے رہیں۔ چلنے والے چلتے رہیں اور پھر میونسپلٹی کا سٹیم رولر بھک بھک کرتا ہوا آئے۔۔۔۔۔۔۔ گوراں میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے خوبصورت جسم کو میونسپل کمیٹی کی پختہ سڑک کی طرح بچھا کر آپ ایک طرف کھڑی ہو جاتی تھی۔ پیدل چلنے والوں کی طرح تھکے ہوئے کلرک، موٹر کی طرح سبک رفتار چھوکرے، سٹیم رولر کی طرح ہمہمکتے ہوئے موٹے موٹے سیٹھ۔۔۔۔۔ یہ آئے، وہ گئے! یہ گرے وہ پھسلے! یہ بیٹھے، وہ بھاگے!۔۔۔۔۔ اور گوراں کنارے کھڑی مسکراتی رہتی تھی! گوراں اور گوراں کے جسم کے درمیان ایک زبردست دیوار جھن جھن مائل تھی۔ اس دیوار کی بنیاد ایک ننھی سی آرزو پر قائم تھی۔ وہ آرزو دنیا کے خزانوں سے موتی یا ہیرے یا ریشم کے تبار نہیں مانگتی تھی۔ وہ زندگی کے نام پر دو بے لوث لمحوں کی خیرات چاہتی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحے جو اس کی کمرز کھڑ چلتی ہوئی پن پتلی کو جلاوانی سکون دے سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

ظہیر کہتا ہے۔ ”عورت شہد کی مکھی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتے میں رس نکالتی ہے۔“ ظہیر بکنا ہے۔ وہ رتنا بائی کے ہونٹوں کی مٹھاس پر اپنا قلعہ جماتا ہے۔ صادق کی موسیقار آنکھوں سے اپنے مقولے چراتا ہے سور کہیں کا۔ ان دو سوتیلی بہنوں کے سستے ایثار نے اس کو اندھا کر دیا ہے اور

وہ ایسی مکھیوں کے چھتے نہیں دیکھ سکتا جو رس دیتی نہیں، رس لیتی ہیں۔ رس چوستی ہیں۔ رس چراتی ہیں۔۔۔۔۔ بیگم ستار کی طرح، جو بھری محفل میں اپنی جوان چھوکری کو ننگا کر کے بٹھا دیتی ہے۔۔۔۔۔ ”آہ، بیٹا۔ میری ثروت سے ملو۔ ثروت بڑی شرمیلی لڑکی ہے۔“ اور پھر وہ قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان اشاروں ہی اشاروں میں شرمیلی ثروت کی ریشمی ساڑھی اور پتلا بلاؤز اُتار کر رکھ دیتی ہے۔۔۔۔۔ یہ ثروت کی صراحی دار گردن ہے۔ یہ رہے ثروت کے مرمریں کستان۔ یہ ہے ثروت کی چمکیلی کمر۔۔۔۔۔ کوئی دل ہی دل میں بول دیتا ہے: شرمیلی ثروت ایک، شرمیلی ثروت دو، شرمیلی ثروت تین۔۔۔۔۔ قیمت ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار! گوراں بھی یونہی بکتی آئی ہے۔ لیکن گوراں کا نام سنتے ہی بیگم ستار کو غش آجائے۔ حاجی عثمان کی بھنویں تن جائیں گی۔ ڈاکٹر رحم کے ہونٹ بھیج جائیں گے اور غالباً انہیں وہ اُمید افزا لمحے بھی یاد نہ رہیں گے جب وہ انشورنس پالیسی بیچنے والوں کی طرح شادی کا بیمہ کر کے اپنی لاڈلی بیٹیوں کو مکلف شہستانوں کے اندر دھکیل دیتے ہیں۔ ثروت، مجیدہ، زہرہ، خورشید، نجی، عفت۔۔۔۔۔ سب خوشگوار لڑکیاں ہیں۔ حسین ابے حد حسین۔ ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جو نیلے نیلے آسمان کے درمیان جگمگا رہے ہوں۔ ان کے مہکتے ہوئے چمکیلے جسم۔۔۔۔۔ او میرے خدایا! ان کے مہکتے ہوئے چمکیلے جسموں میں چاند اور سورج اور کہکشاں نے اپنا سرمایہ لٹا کے رکھ دیا ہے۔ ان کی نشیلی اور بلیغ آنکھوں میں بڑے بڑے خوش آئند پیام جھلکتے ہیں۔ لیکن ان کی تمتاؤں کی معراج مستقبل کے سہانے سپنوں میں ہے۔ وہ آنے والی کل کا انتظار کر رہی ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے ہو شریا حسن کا خراج وصول کرنا ہے۔ آراستہ بنگلے چمکیلی گاڑیاں۔ بھڑکیلے لباس۔۔۔۔۔ میں ڈرتا ہوں کہ شاید وہ اپنے مصروف لمحوں میں سے ایک بے لوث لمحے کی زکوٰۃ نہ دے سکیں گی۔۔۔۔۔ میں نے ظہیر کی خوشامد کی، کہ دوست! تم گوراں کی زندگی کو جاوید نہیں کر سکتے۔ خدا کے لئے اسے میرے پاس لے آؤ۔ دنیا کی ساری آبادی میں

ایک وہ میری مقدس امانت ہے ”مقدس؟ ارے توبہ توبہ!“ ظہیر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔۔۔۔۔ ”تم نہیں جانتے گوراں کو۔ اس کے جسم میں اتنے اتنے لمبے جراثیم ہیں۔ گلتے ہوئے، زہریلے، مملک کیڑے۔۔۔۔۔ تم مقدس کہتے ہو، اس سڑتی ہوئی لاش کو؟“

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ظہیر کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ اس کے نچلے جبڑے کا ایک دانت کٹاک سے ٹوٹ کر قالین پر جاگرا۔ ظہیر نے گرم گرم، سرخ سرخ خون کی ایک کلی غٹ سے نگل لی۔۔۔۔۔ اور اگلے روز وہ گوراں کو لے آیا۔ وہ آئی۔ بھکتی ہوئی ہچکچاتی ہوئی۔ لجائی لجائی سی۔ جیسے زندگی کے طوفان میں کہیں دور افقی لکیر پر ایک روشنی کا مینار آہستہ آہستہ ابھر رہا ہو! ایک دن میں نے کہا ”گوراں، تمہارا چوبارہ تمہیں زیب نہیں دیتا تم اپنے بالاخانے کے پٹ مقفل کر کے رکھ دو۔“

گوراں حیراں سی ہو گئی۔ اس کے خوشنما ہونٹ تعجب سے کھل گئے۔ ”کیوں؟“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”گوراں، تمہارا وجود معمولی سطحوں سے بہت بلند ہے۔ تم بالاخانے کی کھڑکی میں بیٹھنے والی گوراں نہیں ہو۔ تم کسی کے خوابوں میں بسنے والی عروسانہ تکمیل ہو اگلے مہینے ہم دونوں نیلکری کی شاداب پہاڑیوں پر جانے والے ہیں۔ میں تم کو کوہ ثور کے سینے ٹوریم میں داخل کرادوں گا۔ سینوریم کا بڑھا سپرنٹنڈنٹ میرا دوست ہے۔ وہ تمہارے خون کے قطرے قطرے کو زہریلی چنگاریوں سے پاک کر دے گا۔ تمہاری نس نس میں جو دہکتے ہوئے گھاؤ ہیں وہ بھر جائیں گے۔ تمہارے جیون کو جو گھن کھا رہا ہے، وہ مٹ جائے گا۔۔۔۔۔“

”تم سچ کہتے ہو۔“ گوراں نے کہا۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میرے بالاخانے کے پٹ میری روزی کا راستہ ہیں۔ میں انہیں کیسے بند کر سکتی ہوں بھلا؟“

مجھے گوراں کی جہالت پر غصہ آگیا۔ میں نے اس کی گھنی زلفوں کا گچھا بنا کر اس کے منہ پر بہت سے کوڑے مارے۔ ”تم اپنے بالاخانے سے اپنی روزی کا سہارا نہ لو، گوراں۔ کیا سچ مچ تم سمجھتی ہو کہ میں ساڑھے بارہ سو مہینہ صرف اپنے لئے کما رہا ہوں؟

گوراں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں تیز تیز شعاعیں پھیلیں اور بکھر گئیں۔ اس کا اُپر والا ایک دانت کھج سے نچلے ہونٹ میں دھنس گیا اور پھر یکایک دو چار وحشی جھٹکوں کے ساتھ اس نے اپنی آخری ساڑھی کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ پلک جھپکنے میں میرے سامنے گوراں نہ تھی۔ اس کا جسم تھا۔ خوبصورت۔ مرمیس۔ ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا۔ جھنجھٹا ہوا جسم۔۔۔۔۔

”تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔“ وہ میرے ساتھ لپٹ کر مجھے دونوں ہاتھوں سے نوچنے لگی۔ گوراں کی قیمت بیس کئے رات تھی۔ تم اُسے ساڑھے بارہ سو مہینہ پر چکا رہے ہو۔ تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔ مجھے اپنا شکریہ ادا کرنے دو۔“ اس کے لائبے لائبے سرخ ناخن کئی جگہ میرے جسم میں کھب گئے۔ ایک خون آشام نظر اس نے چاروں طرف دوڑائی۔ میز کے گلدان کو اٹھا کر زور سے بٹخ دیا۔ اپنی ساڑھی کے اُلجھے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹا۔ اور آہستہ آہستہ چلی گئی۔ جیسے دور سے جھلکنے والا روشنی کا مینار سمندر کی لہروں میں تحلیل ہو جائے۔۔۔۔۔ گوراں کی سسکیوں میں لپٹی ہوئی ایک آواز رو رہی تھی۔۔۔۔۔ ”تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوٹ لمحہ نہ دے سکے۔ تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوٹ لمحہ نہ دے سکتے۔“

مایوس۔ غمیدہ۔ بیزار۔۔۔۔۔ گوراں فٹ پاتھ پر ہو لے ہو لے جا رہی

ہے جانے دو۔ وہ اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گذرتا ہوا راہرو اسے خرید لے گا۔۔۔۔۔ خرید نے دو۔ مجھے اس پر کوئی اختیار بھی تو نہیں۔۔۔۔۔

ریاسدگی میں ہائے ہوز اور ہائے کُطی کا امتیاز ممکن نہیں ہے اس لئے جو قہوہ پینا چاہتے تھے، وہ قہوہ پیتے رہے۔ اور جو قہوے کی جگہ قہوے کے برتنوں سے دلچسپی لیتے تھے، وہ برتنوں سے دلچسپی لیتے رہے۔ دو رنگا بھی دلچسپیوں کا عادی تھا۔ لیکن ایک دن یکایک اس کے برتن لبالب بھر کے چھلک اٹھے، اور برص کے سفید داغوں کی طرح بار بار بھی اس کی زندگی کے ساتھ چپک کے لگ گئی۔

حادثات ہی تو ہیں!

دو رنگا

نام ضمیر، پیشہ انجینئری۔ لیکن عرفاً اسے دو رنگا کہتے تھے۔ اس نام سے اس کو چڑھتی۔ لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کے منہ پر برص کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ گالوں پر، ماتھے پر، ہونٹوں پر، کانوں کے پاس، ٹھوڑی کے نیچے، گردن کے ارد گرد، آنکھوں کے پوٹوں پر۔۔۔۔۔۔ ہر جگہ سفیدی کے بڑے بڑے چوڑے چوڑے داغ تھے جن کے درمیان جا بجا اصلی جلد کے کالے کالے نشان بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔ جیسے سمندر کے جھاگ پر کونکوں کے ذرے تیر رہے ہوں۔

کچھ لوگ اُسے دھوپ چھاؤں کہتے تھے۔ لیکن یہ نام اس کے دفتر کے کلرکوں اور چپراسیوں تک ہی محدود تھا کیونکہ وہ اس کے مزاج میں دھوپ کی تیزی اور دسمبر کی کپکپا دینے والی چھاؤں سے کافی واقف تھے۔

دو رنگی جلد، دو رنگا مزاج، قسمت بھی اس کی زندگی کو ہر پہلو سے دوغلا بنانے میں مدد دے رہی تھی۔ چنانچہ جب وہ لندن سے انجینئری کا امتحان پاس کر کے لوٹا، تو اپنے ساتھ ایک سفید فام بھورے بالوں والی چھوکری بھی لیتا آیا۔ باربرا ایسٹ اینڈ کے ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں برتن دھونے پر ملازم تھی۔ اس قہوہ خانے میں برتن دھونے والیوں کی تعداد برتنوں سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ تاہم لوگ وہاں جوق در جوق قہوہ پینے جاتے تھے۔ کچھ من چلے ہندوستانیوں نے اس جگہ کا نام قہوہ خانہ رکھ دیا تھا۔ لیکن انگریزی زبان کی بے

جب وہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ اسے اپنی سیاہ جلد کی یک رنگی اور پختگی پر ایک عجیب قسم کی کمتری کا احساس ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔ نیو ہوسٹل میں ایک لطیفہ تھا کہ دنیا کے مکمل ترین چاند گرہن کا حساب لگانا ہو تو کالج کے رجسٹر سے ضمیر کی تاریخ پیدائش نکال کے اس میں سے نو مہینے کے دن تفریق کر دو۔۔۔۔۔۔! مذاق ہی مذاق میں لڑکے اسے اپنے بستر کی سفید چادروں سے اٹھا دیتے تھے۔ پختہ رنگ ہے بھئی۔ پسینے کا ایک قطرہ بھی ٹپک گیا، تو داغ پڑ جائے گا! وہ دل ہی دل میں اپنی کلاس کی زیب النساء سے محبت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کی محبت کی انتہا یہ ہے کہ وہ ایک بار زیب النساء کے عنابی ہونٹوں کو چوم لے! وہ سادگی پسند اور قناعت شعار عاشق تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ محبت کو سرمایہ دارانہ لالچ کے زہر سے بے لوث رکھنا چاہیے۔ خوبصورت عورت چلتا پھرتا ثور ہے۔ وہ سب کی مشترکہ امانت ہے۔ اس کی ایک چھمچاتی ہوئی کرن زندگی کو سرشار کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ زیب النساء سے کہا کرتا تھا کہ تو دنیا بھر کے عاشقوں کی مساوی پونجی ہے۔ اس میں میری محبت کا حصہ صرف اتنا ہے کہ میں تیرے نازک اور خوں آشام ہونٹوں سے ایک چھوٹا سا سلس چڑا لوں! زیب النساء نے کہا۔ ”بہت خوب مجھے منظور ہے۔ لیکن کیا آپ مجھے یہ گارنٹی دیتے ہیں۔ کہ آپ کے ہونٹوں کا رنگ کچا نہیں ہے؟“۔۔۔۔۔۔

لندن پہنچ کر ضمیر کے ساتھ دو حادثے پیش آئے۔ ایک تو یہ کہ اس کی زندگی میں دو رنگی علامات کا ظہور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے بڑے

شوق سے ویسٹ اینڈ کی ایک دکان سے ہڈنٹ بلو کا بانکا سا ڈنر سوٹ بنوایا۔ یہ دوسری بات ہے، کہ اس سوٹ کی نمائش کے وقت اس سے ایک فاش، لیکن معصوم غلطی سرزد ہوئی۔ یعنی جب اس نے پہلی بار اپنا سیاہ ڈنر سوٹ پہنا، اس وقت دن کے ایک بجے لُنج کا ٹائم تھا!۔۔۔۔۔۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ ضمیر کی جلد کی سیاہی اس کی اجلی خواہشات کے راستے میں حائل نہ ہو۔ اس لئے ایک دن بیٹھے بٹھائے اس کے بدن پر برص کے بڑے بڑے سفید داغ نمودار ہونے لگے۔ قدرت فیاض بھی ہے اور بخیل بھی۔ بد قسمتی سے وہ ضمیر کے حق میں بخیل ثابت ہوئی کالی جلد پر سفیدی کا جو عمل جاری ہوا تھا وہ ادھورا ہی رہا۔ ضمیر کا اوپر والا ہونٹ اپنی اصلی حالت میں تھا۔ لیکن نچلے ہونٹ پر دہی کی پٹکیاں سی بکھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ جیسے وہ برفانی ہوئی نمکین لٹی کا گلاس پی کر ہونٹوں پر زبان پھیرنا بھول گیا ہو! اگر زیب النساء لندن میں ہوتی تو وہ شوخ اور شریر لڑکی ضرور چلاتی۔۔۔۔۔۔ ”میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ تمہارا رنگ کچا ہے۔ جو لندن کے ایک ہی چھینٹے سے دھل گیا۔“

دوسرا حادثہ ایسٹ اینڈ کے قہو خانے میں پیش آیا۔ یعنی باربرا برص کے سفید داغوں کی طرح اس کی زندگی کے ساتھ چپک گئی۔۔۔۔۔۔ اس نے دونوں مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لئے بہت سی جدوجہد کی۔ بہت سا روپیہ لٹایا۔ لیکن کوئی دوا، کوئی آپریشن اسے نجات دلانے میں کامیاب نہ ہو سکا وہ شکست کو شکست ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ تاریکی میں روشنی کے نشان تلاش کرتا تھا۔ میری جلد؟ میری جلد زخم خوردہ ہے۔ ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں پٹرول ٹینک کو آگ لگ گئی۔ لپکتے ہوئے شعلوں نے چار انجن کی اس ٹیاب مشین کو دیکھتے ہی دیکھتے خاک کر دیا۔ فرض کی انجام دہی ہر عالم میں لازمی ہے۔ پائلٹ کو بچاتے بچاتے میرا اپنا جسم مجلس کے دھواں ہو گیا۔ لیکن فرض آخر فرض ہے۔۔۔۔۔۔ میری بیوی؟ میری بیوی لٹکاشاز کے سروہلیم میکفرسن کی اکلوتی بھتیجی ہے۔ ان کے کارخانوں کی ملل دنیا بھر کی منڈیوں میں

کھیتی ہے۔ باربرا بڑی خود رار لڑکی ہے۔ ہماری پہلی ملاقات پرائم منسٹر کی گارڈن پارٹی میں ہوئی۔۔۔۔۔۔ کون حرامزادہ کہتا ہے وہ ایسٹ اینڈ کے قہو خانے میں برتن دھویا کرتی تھی؟۔۔۔۔۔۔

جب وہ جہاز سے اترے۔ تو بمبئی کے تاج محل میں ان کی ملاقات راجکمار دلاور سنگھ سے ہوئی۔ دو رنگا کار آزمودہ شکاری تھا۔ لندن میں اس نے بہت سے نرالے گر سیکھے تھے۔ ایسٹ اینڈ والے کافی ہاؤس کا مالک قہوے کے ساتھ بسکٹوں کی جگہ جوان چھوکریاں بیچتا تھا۔ ویسٹ اینڈ لینڈ لیڈی مالدار مہمان پھانسنے کے لئے اشتہار کی جگہ اپنی خوبصورت لڑکیاں دیا کرتی تھی۔ دورنگے نے آتے ہی ہنسل کے ساتھ باربرا کا کچلتا ہوا بدن چپکا کر کنڈی دریا میں ڈال دی۔ دلاور سنگھ لالچی مچھلی کی طرح لپکا، اور پھنس کے اٹک گیا۔ شمشیں، و سکی، کاک ٹیل اور تاج محل ہوٹل کی بھڑکیلی رقص گاہ آدھی رات تک باربرا سفید ریشم کے لچھوں کی طرح دلاور سنگھ کی بانہوں سے لپٹی ہوئی ناچتی رہی۔ اگلی صبح یکایک راجکمار کو یاد آیا کہ اس کی ریاست کے لئے ایک قابل انجینئر کی فوری ضرورت ہے۔ دورنگے نے تجاہل عارفانہ برتا۔ ”یہ ناچیز ملازمت کے اہل کہاں ہے کمار صاحب۔ اپنی طبیعت تو سیلانی ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ اور پھر یہ انجینئر تو وقت کاٹنے کا بہانہ ہے۔۔۔۔۔۔ باربرا کے چچا سروہلیم میکفرسن کے کارخانوں میں۔۔۔۔۔۔ راجکمار دلاور سنگھ نے لٹکاشاز کے سروہلیم میکفرسن کے کارخانوں کی تفصیل بڑے اٹھماک سے سنی اور پھر سوزوگداز کے ساتھ اپنی ریاست کی زبوں حالی کا نقشہ بیان کیا۔۔۔۔۔۔ رعایا کی غربت پر لمبی لمبی آہیں بھریں۔ تجارت اور صنعت کی پستی کا رونا رویا۔ اپنے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کی نااہلیت پر لعنت بھیجی۔ اور پھر ریاست کی ترقی کے امکانات پر بھی روشنی ڈالی۔ گھنے اور وسیع جنگل، تیز رو پہاڑی ندیاں، نیلم اور سونے کی چھپی ہوئی کانیں۔۔۔۔۔۔ ہزاروں سال سے زمین کی چھاتی خزانوں کے انبار سنبھالے بیٹھی ہے۔ اگر مسٹر ضمیر چاہیں تو آسانی سے اس نایاب دولت کو بے نقاب کر

دورنگے کے محکمے میں روپوں کی بھری ہوئی تھیلی اور چھوکری کے بھرے ہوئے جسم کے درمیان ترقی کے دروازوں کا کھل سم سم پوشیدہ تھا۔ ترقی کے دروازے ہی نہیں، روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھنے والے دونوں کا درویدار بھی ایک چھوکری کے کالے، پیلے، یا بھورے جسم پر قائم تھا۔ اگر کسی روز اس کی جیب یا گود خالی رہ جاتی تھی۔ تو آسمان سے آنے والی روزی کا اک سورج بند ہو جاتا تھا۔ ایک روز جب دورنگے۔۔۔۔۔۔ بدبو سے مکے ہوئے دورنگے۔۔۔۔۔۔ کی نوک قلم نے قاضی عبدالقدوس، روڈ محرر کے رزق پر بندش کی مر لگا دی، تو بچارے قاضی کو اپنی نمازیں اور اپنے روزے بے کار نظر آنے لگے۔ ان کی اُمیدوں کا آسرا خدائی مسند کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی دال روٹی فرشتوں کے دوش پر آسمان سے اترتی ہے۔۔۔۔۔۔ اور اب جو انہوں نے دیکھا، کہ ایک بد صورت، گھناؤنا دورنگا انسان ان کے آب و دانے پر مطلق طور پر قادر ہے۔۔۔۔۔۔ تو انہوں نے منہ پھاڑ اپنے خدا کو ایک فحش گالی دی۔

ایک روز دو رنگا باغیچے میں بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا، یکایک کوٹھی کے صحن سے پہلے گالیاں اور پھر چیخیں سنائی دیں وہ بھاگ کر اندر گیا۔ اس کا خانساں جمال خاں کچن کے پاس پڑا چیخ رہا تھا۔ اس کی چھاتی پر کوٹھی کا مہتر چیتے کی طرح سوار بیٹھا تھا۔ اس کے اکڑے ہوئے پنجے جمال خاں کی گردن کو نوچ رہے تھے۔۔۔۔۔۔ ”سالا حرامی۔ ہماری مریا کو تاکتا ہے؟ خون پی لیں گے سالا حرامی کا۔۔۔۔۔۔“ صحن کے کونے میں ایک کالی کلوٹی، بھیگی سی عورت سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ دو رنگا ہنسنے لگا، کہ یہ اُلٹو کا پٹھا مہتر آخر کس نعمت کے لئے یوں اکڑ رہا ہے۔ چڑیل ایسی صورت ہے حرامزادی کی۔ اس نے بڑھ کر مہتر کی پیٹھ پر کس کے ایک لات جمائی۔۔۔۔۔۔ شاید ایسے ہی کچھ شدید جھٹکے ہوتے تھے، جو کبھی کبھی دورنگے کی چھاتی میں سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کر دیتے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے اسے اپنی بار بار یاد آئی۔ وہ شاید اس وقت کمار

بہادر کے ڈریسنگ روم میں نیم برہنہ اپنا میک اپ کر رہی ہو گی۔ کمار چلیے دیوان پر لیٹا ہوا اسے ہر پہلو اور ہر زاویے سے جھانک رہا ہو گا۔ خیال ہی خیال میں ضمیر غصے سے بے تاب ہو کر کمار کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے اپنے تیز ناخنوں والی انگلیاں کمار کی پھولی ہوئی گردن میں گاڑ دیں۔ وہ زبان نکال کر جھکا کہ کمار کا گرم گرم خون چاٹ جائے۔۔۔۔۔۔ اور عین اس وقت کسی نے اس کی پیٹھ پر زور سے لات جمادی۔ یہ دو رنگا تھا۔ دو رنگا زور زور سے ہنسنے لگا۔۔۔۔۔۔ ذیم نان ہنس! اُس نے جمال خاں کے سینے پر چڑھے ہوئے مہتر پر دو چار لاتیں اور کس کس کے مار دیں۔ شکل تو دیکھو چڑیل کی جس کے لئے اکڑ رہا ہے سالا! اگر ضمیر میں کچھ ہمت ہوتی، تو وہ ضرور جواب دیتا کہ یہ سالا تو چڑیل کے لئے اکڑ رہا ہے لیکن تم اپنی پھول جیسی باربرا کے لئے کیوں نہیں اکڑ جاتے؟

آخر ایک دن دو رنگا بچ اکڑ گیا۔۔۔۔۔۔ باربرا کے لئے نہیں اپنی ملازمت کے لئے۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ چند روز سے ایک گھٹیا کمارا ہوا ساٹھ سالہ پاری بڑھا اس کے دفتر میں دخل در معقولات دینے لگا ہے۔ یہ مسٹر بائلی والا بمبئی کی کسی سینٹ کمپنی کا ہیڈ اکاؤنٹنٹ رہا تھا۔ اب وہ کمار کی درخواست پر ریاست سورج نگر میں سینٹ کے کارخانے قائم کرنے آیا تھا۔ ریاست میں لائٹ سٹون کوئی پہاڑی تو نہ تھی، لیکن مسٹر بائلی والا کے ساتھ اس کی جوان بیٹی ضرور تھی۔ مس بائلی والا کے سینے پر بریلی چوٹیوں والے اونچے اونچے کھسار تھے۔ ان مرمر چٹانوں سے اول درجے کا سینٹ کریدنا کوئی پیچیدہ عمل نہ تھا۔ دو رنگا ریاست کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے اپنے ساتھ ایک خوشنما ریشم کاکیرا لیتا آیا تھا۔ مسٹر بائلی والا نے کارخانوں کیلئے سینٹ کی پہاڑیاں اٹھالایا تھا۔ رفتہ رفتہ شہوت کی ٹہنیوں کے سامنے مرمر کی چٹانیں سر اٹھا کے جم گئیں، اور ایک روز مسٹر ضمیر الدین جلالی خرابی صحت کی بنا پر استعفیٰ دیکر لنکا شائر کے سرو لیم میکفرسن کے کارخانوں کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے دہلی آ گئے۔

جلترنگ

صبح سے اس کے دوبار نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جھلس دیا گیا ہو۔ سانس کی ہوا بھڑکتی ہوئی لالٹین کے دھوئیں کی طرح کثیف اور گھٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ تنگ آ کر ناک کو رومال سے بند کر لیتا تھا۔ اور منہ کھول کر سانس لینے لگتا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں میں اس کا گلا خشک ہو کر سوکھے ہوئے پتے کی طرح چڑمڑانے لگتا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ زور زور سے رو دینا چاہتا تھا، لیکن رونہ سکتا تھا۔ اب وہ سیانا ہو گیا تھا۔ اگلے سال میٹریکولیشن کے امتحان میں بیٹھنے والا تھا۔ محلے کی لڑکیاں جن کے ساتھ وہ مٹی کے گھروندے بنا کر کھیلا کرتا تھا۔ اب اس کے سامنے جسم چرا کر سمٹ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ جتنا نابائی بھی اس کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا کر روزنامہ انقلاب زور زور سے پڑھ کر سنانے کو کہا کرتا تھا۔

جتنا پہلوان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھنے کا اعزاز محلے میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا تھا۔ گلی کے نکر پر اس کا شور تھا، جس کے ماتھے پر ”خوش لذیذ ہوٹل از طرف جمال دین پہلوان خادم قوم“ کا سائن بورڈ لٹکا رہتا تھا۔ ہوٹل میں ایک باورچی تھا۔ اس کا نام تاج دین تھا، موقعہ و محل کے لحاظ سے جتنا پہلوان اسے خانساں، بلر، بوائے، تاجو، اور اُلو کی دم فاخستہ کے مناسب القاب سے بلایا کرتا تھا۔ خوش لذیذ ہوٹل کے عقب میں ایک بوسیدہ چھجا تھا۔ جس

دہلی میں اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا، کہ باربرا کو بجلی، پانی، بھاپ کے ایک خفیہ ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس کماری سے لیکر ہمالیہ پر بہت تک ہزاروں غلاظت کے ڈھیر ہیں۔ اور ان ڈھیروں میں لاکھوں کیڑے ریختے اور مرتے ہیں۔ وطن عزیز چھوڑنے کے بعد باربرا نے ایسے ہی کثافت کے گواروں کی نجات کا بیڑا اٹھایا تھا۔ کیا فطرت کی مہربان طاقتیں بجلی، پانی، بھاپ کے اثر سے اس کا ہاتھ نہ بٹائیں گی؟

شام کے وقت جب خالد سکول کے کھیلوں سے لوٹا تو جمو پہلوان اسے آواز دے کر اپنی چارپائی پر بٹھا لیتا تھا۔۔۔۔۔ ”آؤ بیٹا خالد بابو۔۔۔۔۔ ارے او تاج دین ایک پلیٹ میں مصالحہ دار بھی ہوئی بوٹیاں تو لاؤ ذرا۔ دیکھتے نہیں بیٹا خالد بابو آیا ہوا ہے۔۔۔۔۔“ اور جب پہلوان اور خالد دونوں مل کر بوٹیوں کا چٹخارہ ختم کر لیتے تھے تو روزنامہ انقلاب کا دور شروع ہوتا تھا۔ خالد فرفر اخبار سنا، اور جمو پہلوان لیٹے ہی لیٹے خبروں پر تبصرہ جاری رکھتا۔ وہ شہیدانِ طرابلس کے نام پر چندہ اکٹھا کرنے کے لئے رضا کاروں کی ایک ٹولی کیساتھ بمبئی کلکتہ اور حیدر آباد کی طرف گھوم آیا تھا۔ اس لئے وہ بین الاقوامی معاملات پر رائے زنی کرنا اپنا عملی حق سمجھتا تھا۔ اگرہے کے پچھم میں چین کا بادشاہ بمبئی کے پاس ہانگ کانگ کا ملک، انگریزی ولایت کے عقب میں طرابلس کا میدانِ جنگ جمو پہلوان کے تبصرے میں تین چیزیں خاص طور پر نمایاں ہوتی تھیں۔ خالد کو کبھی کبھی اس بے تکلف زنی پر ہنسی آتی تھی۔ لیکن پہلوان کو نوکنا خلافِ مصلحت سمجھتا تھا۔ ایسا کرنے سے وہ صرف جمو پہلوان کی چارپائی پر بیٹھ کر مصالحہ دار بوٹیاں اڑانے کا مزاکرہ کر رہا ہو جانے کا ڈر تھا بلکہ پہلوان کی

ہوٹل کے سامنے سڑک پر ایک مضبوط سی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ اس پر جتو پہلوان تکیہ لگائے میر مجلس کی حیثیت سے بیٹھتا تھا۔ گاہکوں، ملاقاتیوں اور مسافروں کے لئے آس پاس لکڑی کے بیچ اور لوہے کی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ بیٹھے بٹھائے دل میں کئی بار پہلوان کو شک ہوتا تھا کہ شاید گوشت ٹھیک طرح بھونا نہیں گیا، شاید کبابوں میں مرچ زیادہ ہو، شاید قیمے میں نمک کم ہو۔۔۔۔۔ اس لئے وہ ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد اپنے خانماں بٹلریا بوائے کو آواز دے کر گوشت کا بھرا ہوا پیالہ یا کبابوں کی پلیٹ منگوا کر چکھ لیا کرتا تھا کبھی کبھی تاج دین صدائے احتجاج بلند کرتا تھا کہ ”پہلوان ایک ہی دفعہ اطمینان سے کیوں نہیں کھا لیتے؟ اب ہوٹل کی بکری کے لئے خاک چیز بچے گی؟

نظر میں اس کا علمی درجہ گر جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ چنانچہ خالد مناسب طور سے پہلوان کی باتوں میں لقمہ ہی دیا کرتا تھا۔ پہلوان خوش ہو کر اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتا۔۔۔۔۔۔ ”ساباش، بیٹا خالد بابو۔ خوب علم کما رہے ہو۔۔۔۔۔۔ جلدی جلدی کالج کر لو، بیٹا ڈپٹی کمشنر بن کے رہو گے۔۔۔۔۔۔ ہاں، جتو پہلوان کی بات پتھر پر لکیر ہے۔۔۔۔۔۔ ہاں!“ ڈپٹی کمشنر کا نام سن کر مقدمہ باز مسافروں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ دم بھر کے لئے حُفے کی نئے چھوڑ کر خالد کو ایک عجیب سی عقیدت مندی کے ساتھ دیکھنے لگتے تھے۔ اس وقت ان کے دل میں خفیہ سے ارمان اٹھتے تھے، کہ وہ کسی روز اپنے بیٹوں کو شہر لا کر خالد سے ملا دیں۔ قسمت تو سب کی اپنے اپنے ساتھ ہے، لیکن کون جانتا ہے کہ یہ ملاقات کسی وقت ان کے بیٹوں یا پوتوں کی مقدمہ بازی میں کام آجائے!“ پتا پر پوت، گھوڑے پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا“ جتو پہلوان کہا کرتا تھا۔ کیوں نہ ہو اپنے باپ کا بیٹا ہے شاباش میرے شیر! جلدی جلدی کالج کر لو بیٹا خالد بابو۔۔۔۔۔۔“

جتو پہلوان کے منہ سے اپنے باپ کا ذکر سن کے خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی آگرے کے پچھم میں چین کے بادشاہ کی طرح کوئی فرضی ہستی ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ وہ ابھی ڈیڑھ برس کا تھا۔ جب اس کے والدین ریل کے حادثے میں کٹ کر مر گئے تھے۔ خالد کو اس کے ماموں نے اپنے زیر سایہ لے لیا تھا۔ ماموں تو تجارت کے لئے زیادہ عرصہ باہر رہتے تھے۔ لیکن ممانی نے خاصی توجہ سے اس کو پالا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ بھی کرتی تھی۔ البتہ جہاں معاملہ خالد اور عزیزہ کے درمیان ہو، وہاں ممانی کا انصاف کھلم کھلا عزیزہ کا ساتھ دیتا تھا۔ عزیزہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ عمر میں خالد سے تین برس بڑی تھی۔ لیکن خالد مجبوراً اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر بازار لے جایا کرتا تھا۔ عزیزہ غصے میں آکر اس کا منہ نوچ لیتی تھی، قلم توڑ دیتی تھی، کتاب پھاڑ دیتی تھی۔۔۔۔۔۔ اور اگر ممانی سے پٹتا

تھا تو غریب خالد۔۔۔۔۔۔ ایک روز وہ دونوں رسائی میں لیٹے ہوئے تھے بیس تک گنتی یاد کر رہے تھے۔ کسی بات پر الجھ گئے۔ عزیزہ نے کھٹ سے اسے گردن پر کاٹ کھایا۔ خالد کی قمیص خوں سے لٹھر گئی، اور وہ شاید پہلا موقع تھا جب ممانی نے خالد کے لئے عزیزہ کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا۔ خالد کی گردن پر بائیں طرف دانتوں کا ایک گہرا نشان اب تک نئے چاند کی طرح نمایاں تھا۔

شاید یہ بچپن کے دبے ہوئے نقوش تھے، جن کی وجہ سے خالد کے دل میں اب تک عزیزہ کے لئے ایک مبہم سی بے اعتنائی ڈر اور شاید نفرت کا ملا جلا جذبہ باقی تھا۔ وہ عزیزہ کے ساتھ نہایت عمیق سرد مہری کا برتاؤ کرتا تھا۔ اور حتی الوسع اس کی موجودگی میں ہنسنے اور بولنے سے احتراز کرتا تھا۔ لیکن عزیزہ ایسی نہ تھی۔ وہ خالد کے آرام کا ہر ممکن خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ ہر طرح سے اس کے ساتھ خوبصورت باتیں کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن خالد رکھائی سے ٹال دیتا تھا۔ عزیزہ اس کے کپڑوں پر استری کر دیتی تھی، کمرے کی چیزیں قرینے سے سجا دیتی تھی۔ اگر اس کے سر میں درد ہوتا تھا تو سرد بادیتی تھی، اگر فٹ بال کھیلتے ہوئے اس کے پاؤں میں موج آ جاتی تھی، تو اس کی رضائی میں بیٹھ کر گھنٹوں پاؤں دباتی رہتی تھی۔۔۔۔۔۔ ایک روز ممانی پڑوس کی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ خالد انفلونزا کے شدید بخار میں مبتلا پڑا تھا۔ اس کے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ عزیزہ نے اس کا سر دبایا، بازو دبائے، کمر دبائی، گھٹنے دبائے، لیکن خالد کراہتا رہا۔ عزیزہ بولی، ”میں ایک ترکیب کرتی ہوں خالد۔ تم سیدھے لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے سارے جسم پر ایک ساتھ دباؤ ڈالتی ہوں۔“ عزیزہ نے اپنے بھرپور جسم کے سارے گداز کو خالد پر مسل ڈالا۔ لیکن اس کے درد میں کمی نہ ہوئی۔ عزیزہ لاکھ کستی رہی، کہ ذرا ٹھہرو۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے لیکن وہ جھنجھلا کر اٹھا، اور کمبل اوڑھ کر دوسرے پلنگ پر جا لیٹا۔۔۔۔۔۔

اگلے سال وہ میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ سکول میں گرمی کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ وہ صبح سویرے کتابیں لے کر کمپنی باغ چلا جاتا تھا۔ اور دوپہر تک آم کے پیڑوں کی چھاؤں میں لیٹ کر پڑھتا رہتا تھا۔ اب کئی روز سے کمپنی باغ نہ جاسکا تھا۔ کیونکہ دوپہر کے وقت اُسے نکسیر آ جاتی تھی۔ ممانی کا خیال تھا کہ گرمی کا غبار ہے، تھوڑا بہت نکل جائے تو اچھا ہے۔ تاہم احتیاط کے لئے اس نے خالد کو گاجر کی کلو نجی بنا دی تھی، اور صبح شام تازہ مکھن میں کالی مرچ اور کدو کے مغز ملا کر اسے چنا دیتی تھی۔ لیکن آج صبح سے اس کو دوبار نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جھلس دیا ہو۔

اس نے بیزار ہو کر تولیہ کندھے پر ڈالا، اور غسل خانہ کی طرف چلا دیا۔ شاید ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں سر ڈبو کر اسے تسکین ہو۔ لیکن غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے غصہ آیا۔ یہ بھی کوئی نہانے کا ٹائم ہے بھلا۔ وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا گھومنا اور گھومتے ہی یونہی نادانستہ طور پر اس نے کھڑکی کی ایک دراز سے اندر کی طرف جھانکا۔۔۔۔۔۔ جھانکتے ہی اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا، اور بجلی کی طرح تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر وہ لمحہ بھر کے لئے رکا۔ ٹھنکا۔ جھکا۔ اور چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر ایک بار پھر جھانکا۔۔۔۔۔۔ گھومنا پھر، ہچکچایا۔ لیکن پھر جھانکا۔ اس بار اس کی آنکھیں دراز کے ساتھ جم کے رہ گئیں، جیسے مقناطیس کے ساتھ لوہے کے ٹکڑے چمٹ جاتے ہیں!

وہ عزیزہ تھی۔ وہ جگمگاتے ہوئے موتی کی طرح صدف سے باہر نکلی کھڑی تھی۔ یا شاید وہ بجلی کی ایک آوارہ لڑی تھی جو کالی گھٹاؤں کے دبیز پردوں سے باہر نکل آئی ہو۔۔۔۔۔۔ اس نے اپنے گھنے بادل کی لٹوں کو کھولا، اور ہاتھی دانت کی چھوٹی سی کنگھی کو ان کے پیچ و خم میں الجھا کر دیر تک کھیلتی رہی۔ پھر اس نے زلفوں کے انبار چھوڑ بازو اٹھا کر دونوں ہاتھ جوڑے، اور کمان کی طرح تن کر انگڑائی لی۔ خالد ڈرا، کہ شاید زلزلہ آجائے گا۔۔۔۔۔۔ اور

سنگ مرمر کے دو تاج محل گر کر ٹوٹ جائیں گے! اگرے میں محبت کا ایک مرمریں خواب سویا ہوا ہے۔ اگرے کے پچھم میں چین کا بادشاہ حکومت کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن اگرے کے اس طرف بھی تاج محل ہیں۔ برفلی چوٹیوں کی طرح دکتے ہوئے کوستان۔۔۔۔۔۔ ہمالیہ کی چھاتی پر بنائے ہوئے بلوری مینار۔۔۔۔۔۔ عزیزہ نے دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر بالٹی میں ڈال دیئے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر گردن کو زور سے جھٹکا۔ برسات کی کالی گھٹائیں بکھر کر پھیل گئیں۔ بارش کی پھوار فصائیں جھلملانے لگی۔ ایک گستاخ قطرہ صبح کے ستارے کی طرح تاج محل کے کلس میں لٹک گیا۔ عزیزہ شرارت سے اس پر پھونکیں مارنے لگی۔ وہ جھولتا رہا۔ جیسے سفید گلاب پر جڑے ہوئے شبنم کے موتی کو نسیم صبح تھپیڑے مار رہی ہو۔۔۔۔۔۔ اور جب وہ مجبور ہو کر ایک مچلتے ہوئے آنسو کی طرح گرنے لگا، تو عزیزہ نے جھک کر اسے اپنے ہونٹوں کے درمیان دبوچ لیا۔۔۔۔۔۔ وہ نہا رہی تھی۔ پانی کی لہریں پہاڑی چشموں کی طرح اپنا جلت رنگ بجانے لگیں۔ تاج محلوں کے دامن میں جمنائے کے سیمائی دھارے بننے لگے۔ کوہساروں پر کھکشاں کا غبار سا چھا گیا۔ میدانوں پر قوس قزاح کے فتارے سے چھوٹنے لگے۔۔۔۔۔۔ یہ مچلتا ہوا سیلاب کہاں جا رہا ہے؟ اس بے پناہ طوفان کو کس سمندر کی گود سنبھالے گی؟۔۔۔۔۔۔ خالد کی باہیں سانپ کی طرح بل کھا کر کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ لپٹ گئیں۔ پتھر کی دیوار میں ریشم جیسا لوچ آگیا۔ وہ دمبدم دیوار کے سینے میں سمایا جا رہا تھا۔ شاید اگلے لمحے وہ جھپاک سے اندر جا گرے گا۔۔۔۔۔۔ گرتے گرتے اس کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی آنکھیں دم بھر کے لئے بند ہو گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ برفانی چوٹیوں کے ساتھ لپٹا ہوا لٹو کی طرح گھوم رہا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دے کر آنکھیں کھول دیں، اور جلدی سے تولیہ اٹھا کر اپنی خشک ناک پر رگڑنے لگا۔۔۔۔۔۔ اسے شک ہوا کہ شاید نکسیر پھر بہہ رہی ہے!!

کوئی تیرا یا نہ ہوتا تھا جو اس کی چھاتی میں سن سے پوست ہو جائے، شکاریوں کی چھریاں کند تھیں۔ ان کے دست و بازو لرزاں تھے۔ وہ شرکی منڈیوں سے کٹا کٹایا گوشت خریدنے کے عادی ہو گئے تھے۔ ان میں یہ تاب کہاں تھی کہ وہ جنگل میں آہوئے وحشی خرام کی چھاتی پر چڑھ بیٹھیں!

فریدہ جوان اور خوبصورت ہی نہیں تھی۔ وہ جوانی اور خوبصورتی کے احساس سے لبریز تھی۔ لبالب بھرپور۔ شراب کی صراحی کی طرح، جسے ساقی کی انگلیوں کی ہلکی سی جنبش بے اختیار چھلکا کے رکھ دے۔ خوبصورت تو گلی کی اور لڑکیاں بھی تھیں۔ حمیدہ۔ صہجی۔ جو تھیکا۔ سدامنی۔ نمیدہ۔ کلثوم اور بیچ در بیچ آوارہ زلفوں والی ریحانہ جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جمی رہتی تھی، اور گالوں پر سرے کے بنے ہوئے نقلی ٹل۔۔۔۔۔۔ وہ جوان بھی تھیں، لیکن انگیٹھی میں سلگتے ہوئے نمیدہ کو ٹلوں کی طرح، جنہیں پھونکیں مار مار کر دھکایا بھی جائے تو لمحہ بھر کو بھڑک کر پھر اندر ہی اندر سلگنے لگتے ہیں۔ فریدہ تو ایک شعلہ تھی۔ محض آگ یا انگارہ نہیں۔۔۔۔۔۔ ایک شعلہ، لپکتا ہوا، لہکتا ہوا، چمچھاتا ہوا، جو اپنی تابانیوں کے لئے کسی سہارے کا منت کش نہیں ہوتا۔ بلکہ فاسفورس کی طرح اپنے آپ بھڑک اٹھتا ہے۔ بچپن میں کوئی اسے بے چین بوٹی کہتا تھا، کوئی کہتا تھا چنگاری ہے بابا چنگاری۔ آخر بڑھتے بڑھتے یہ چنگاری انگارہ ہوئی، اور جوان ہو کر شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ گھر کی ساری کھڑکیاں بند رہتی تھیں۔ دروازوں پر موٹی موٹی چھتیاں پڑی رہتی تھیں۔ اور پاسبانی کے لئے فریدہ کی ماں، فریدہ کی خالہ، فریدہ کی آپا نیپالی دربانوں کی طرح چوکس رہتی تھیں۔ لیکن نور ڈھانپنے سے اتنا ہی پتتا ہے۔ ٹانگ شاہی اینٹوں کی ڈیڑھ فٹی دیواریں بھی فریدہ کو اپنی اوٹ میں چھپا کر رکھنے سے قاصر تھیں۔ ساز کے پاؤں میں تو بیڑیاں تھیں، لیکن سوز کا راستہ کون روکتا؟ گلی میں آنے جانے والے راہگیروں کو اچانک ایک غیر مرمی ایک ناقابل فہم سا احساس ہوتا تھا، کہ اس گھر میں کچھ ہے۔ رنگ برنگی چوڑیوں کی ایک کھنک، دبے دبے قمقموں کی ایک

ڈاگی

فریدہ بد نام ہو گئی تھی۔ ڈاگی پر لوگ انگلیاں اٹھاتے تھے، یہ بات نہیں کہ وہ گلی کوپے میں جوان چھوڑوں کے ساتھ آنکھیں لڑاتی تھی۔ نہ یہ کہ اندھیری رات میں اس کے چور دروازے کے آس پاس کوئی پڑا سرار یا رمنڈ لایا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔ بلکہ فریدہ تو محلے کے دل پھینک جوانوں کے لئے انگوروں کا گچھا تھی۔ جو پکے ہوئے رس سے چھلکنے کے باوجود بھی ترش تھے! بڑے بڑے بانکے ترچھے گہر و اس کے سامنے کئی کترا کر نکل جاتے تھے۔ فریدہ ان کے دل پہ راج کرتی تھی۔ لیکن وہ اپنی رانی کو پس پردہ پوجتے تھے۔ کھڑکیوں، دیواروں، اور چھتوں کی اوٹ میں بیٹھ کر وہ گھنٹوں فریدہ کے دیدار کا رس نگاہوں کے راستے چوستے رہتے تھے۔ چلمن کی آڑ میں فریدہ کی چوڑیوں کی ایک کھنک یا اس کی لرزتی ہوئی آواز کا ایک سر آس پاس کے جوانوں کی نس نس میں کڑکتی ہوئی بجلیاں چھوڑ دیتا تھا۔ فریدہ کے خیال ہی خیال سے ان کے خون میں آتشبازی کے اتار چھوٹے لگتے تھے۔ اور لذتِ احساس کے شدید جھٹکے انہیں ربڑ کی گیند کی طرح چپکا چپکا کر نڈھال کر دیتے تھے۔ لیکن اگر کبھی وہ کوٹھے کی منڈیر پر یا گلی کے کٹڑ پہ اچانک کسی کے سامنے آجاتی تھی، تو جو شیلے شکاریوں کی تنی ہوئی کمانیں ڈھیلی پڑ جاتی تھیں۔ انکے ترکش میں تیروں کی قطاریں درہم برہم ہو جاتی تھیں۔ جنگلی ہرنی انکے سامنے کو کڑے لگاتی گزر جاتی تھی۔ سانس پھلا کر اپنے سینے کا سارا ابھار شکاریوں کے نشانے پر آویزاں کر دیتی تھی۔ لیکن

ہوئے بڑی آپا کو شاید اپنا بیمار خصم یاد آتا تھا جو ایک مرل سا بچہ اس کی جھولی میں ڈال کر سال بھر سے ہسپتال میں پڑا تھا۔

فریدہ سوچتی تھی، کہ خدا جانے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جو خواہ مخواہ پنچے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ کیا وہ کسی سے اپنا خصم مانگتی تھی؟ کیا اس نے آج تک کسی کو اپنا خصم بنایا تھا؟ جو تھیکا تو چوری چھپے ایک بچہ بھی پال رہی تھی۔ صبحی کا ایک ٹانگے والے سے یار نہ تھا۔ جو اسے سکول پہنچانے جایا کرتا تھا۔ اور پیچ در پیچ آوارہ زلفوں والی ریحانہ دودھ پیچنے والے چھو کرے کو باروچی خانے میں لے جاتی تھی جہاں دودھ لیتے لیتے اس کی زلفوں کے خم اور بھی ٹیڑھے ہو جاتے تھے اور اس کے گالوں پر سُرے کے بنے ہوئے نقلی تل مدھم پڑ جاتے تھے! فریدہ تو دن بھر گھر کے کام کاج میں جُستی رہتی تھی۔ وہ کمروں اور صحن میں جھاڑو دیتی تھی۔ کھانے پکانے کا سامان کرتی تھی۔ میلے کچلے کپڑوں کو دھوتی تھی۔ اور مٹانے میں اسے اگر کچھ ملتا تھا تو اماں کی گھرکیاں خالہ بی کی ڈانٹ، بڑی آپا کے طعنے۔۔۔۔۔۔ وہ تو چاہتی تھی کہ گھر بار کا کام سمیٹ کر جب اس کا انگ انگ ٹوٹنے لگے، اور وہ تھک ہار کر اپنی پلنگڑی پر کھٹ سے گر جائے، تو گداز گداز بانسوں کی آغوش اسے اپنی گرفت میں دبوچ لے، اور پیار بھری میٹھی میٹھی تھکیاں اس کے جسم میں چٹکنے والے انگاروں کو سکون کی نیند سلا دیں۔۔۔۔۔۔ لیکن اس سہانے خواب کی تعبیر آخر یہ نکلی کہ ایک دن صحن میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ دالان میں براتیوں کا ہجوم ہو گیا۔ پچھواڑے میں ٹائی پلاؤ اور قورے کی دیکیں پکانے لگے اور شفقِ شام کے کھلتے کھلتے ماں، خالہ بی، اور بڑی آپا نے اپنی ناک کے صدقے ایک بھرپور جوانی کا جنازہ گھر سے نکال دیا۔ اور فریدہ بیگم عمر بھر کے لئے کلیم اللہ خان لولابی کے پلے باندھ دی گئی۔

کلیم اللہ خان لولابی کئی لحاظ سے خوش مزاج اور نیک چلن خاوند تھا۔ لیکن کائی کی طرح جو ٹھنڈے پانی کے سکون پر سوئی پڑی ہو! اس کے دماغ کا

جھنکار، رقصندہ قدموں کی ایک دھمک نائک شاہی اینٹوں کی پختہ دیواروں، ٹاٹ کے موٹے موٹے پردوں اور شیشم کے سنگلاخ دروازوں کا سینہ چیرتی ہوئی راہگیروں کے دامن پر برق سوزاں کی طرح جاگرتی تھی۔ ان کی کن پیٹوں میں خون کا دباؤ تیز ہو جاتا تھا، اور وہ دل کے پردوں میں کسی میٹھے احساس کا سرمایہ چھپائے تیز تیز گزر جاتے تھے۔ سامنے بالکنی میں گورے گالوں والی سدا منی اشاروں کی زبان سے پکار پکار کر دعوتِ نظارہ دیا کرتی تھی۔ فمیدہ جان بوجھ کر کھڑکی کی سلاخوں میں منہ ڈال کر اپنی لابی لابی گردن لٹکائے رہتی تھی۔ صبحی دروازے کی اوٹ سے گلی کی طرف تکتی رہتی تھی۔ جو تھیکا ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد برآمدے میں بال بنانے آکھڑی ہوتی تھی۔ گزرنے والے انہیں دیکھ کر گزر جاتے تھے۔ گھورنے والے انہیں گھور کر نکل جاتے تھے اور للچائی ہوئی نظروں کا یہ تصادم لمحہ بھر کے لئے دونوں طرف کی پیاسی جوانیوں پر ہلکی سی پھوار کر جاتا تھا۔ لیکن جو انوکھا احساس گزرنے والوں کو فریدہ کے گھر میں چھپی ہوئی ایک ان دیکھی، ان سنی، ان جانی کشش سے ہوتا تھا، وہ نہ سدا منی کے گورے گالوں میں تھا، نہ جو تھیکا کی سریلی آنکھوں میں، نہ فمیدہ کی پچیلی گردن میں!

”ہائے ہائے ڈائن، آگ لگے تیری صورت کو۔“ فریدہ کی ماں ڈانٹا کرتی تھی۔ ”جب دیکھو آئینے کے سامنے دیدے منکاتی رہتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں تیرا خصم بیٹھا ہے شیشے کے اندر؟“

”نہ بابانہ۔“ خالہ بی لقمہ دیتی تھی۔ ”جوان جہان بیٹیوں کو مٹ کر ہی جینا چاہئے۔ فریدہ دوپٹہ تو سنبھال نا مراد۔ یہ قبیض کے بٹن کہاں بھاگ رہے ہیں؟ چل سنبھل کے بیٹھ۔۔۔۔۔۔ کیا تو پ خانہ نکالے پھرتی ہے بے حیا۔“

فریدہ کی بڑی آپا ہاتھ نچا نچا کر طعنہ دیا کرتی تھی۔ ”بی بی دودن اور صبر سے کاٹ لو۔ پھر خصم ہی خصم ہے جیون میں۔ چار دن میں گرمی نہ نکل گئی تو کیا۔ صابن کے بلبلوں کی طرح جھاگ بیٹھ جائے گا، ہاں۔۔۔۔۔۔“ اور یہ کہتے

رس بی۔ اسے کی ڈگری نے چوس لیا تھا۔ اس کے جسم کا رس پے در پے بے روزگاری گھول کر پی گئی تھی۔ اور اس کی جوانی کا رس اب ضلع کچہری کی کلر کی نچوڑ رہی تھی۔ جسم اور روح کی اس قربانی کے صدقے اسے ہر مہینے ہتالیس روپے نقد تنخواہ کے مل جاتے تھے۔ ساڑھے پندرہ روپیہ مکان کا کرایہ۔ تین روپے کے جہاز مارکہ سگریٹ۔۔۔۔۔۔ ڈھائی روپیہ پان تمباکو۔۔۔۔۔۔ بیس روپے ہوٹل کھانے کے۔۔۔۔۔۔ اور باقی چند ٹکوں میں وہ کپڑے بھی خریدتا تھا جوڑتے بھی کتابیں بھی، اخبار بھی، اور کبھی کبھی سستی شراب کا اڑھایا کسی سستی سی عورت کا اونگھتا ہوا رستا ہوا، کسماتا ہوا، ڈھیلا ڈھالا جسم۔۔۔۔۔۔ لیکن فریدہ کے آتے ہی اس کے بہت سے بل نکل گئے۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی زندگی کا کُراب ہولے ہولے چھٹ رہا ہو۔ جیسے پالے کے مارے ہوئے، ٹھسرتے ہوئے بدن پر گرم گرم نرم نرم ریشمیں لحاف تان دیا جائے۔۔۔۔۔۔

کلر کی نے کلیم کو زندگی کے بہت سے ٹوکوں سے روشناس کر دیا تھا وہ جانتا تھا کہ تھکے ہوئے حاکم کے سامنے لمبے چوڑے پیچیدہ کاغذات لے جانے سے خاطر خواہ حکم لکھوایا جاسکتا ہے۔ دو چار سکوں کی روپلی جھنکار ایک اُونگھتی ہوئی، رستی ہوئی، کسماتی ہوئی عورت کے جسم کو برقائے رکھ دیتی ہے۔ سستی و سکی کا ایک آدھ جام دماغ کی پریشانیوں پر سکون کا پھاہا رکھ دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن جب جوالا مکھی کی طرح بھڑکتی ہوئی فریدہ اس کی جھولی میں ڈال دی گئی، تو اس کا دامن جل اٹھا۔ اگر فریدہ مسکراتی تھی، تو وہ اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں کے درمیان زور سے چوم لیتا تھا۔ اگر وہ گاتی تھی، تو وہ اس کے گلے کا نور نوک زبان سے چاٹ جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن کچھ ایسی بات تھی کہ فریدہ کے سامنے وہ ہمیشہ بے بس اور مجبور ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ پکے ہوئے آم کی طرح جس پر ذرا سا بوجھ پڑنے سے گٹھلی تو بچ سے دور جا گرتی تھی۔ اور فریدہ کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا تو چھلکا، لچلیا پلپلا چھلکا جسے چوسا بھی

جائے تو کیلے گھونٹوں کے سوا اور کچھ پتے نہ پڑے۔

فریدہ سپنوں کی ایک دنیا سے نکل کر آئی تھی، اور اب وہ سپنوں کی دوسری دنیا میں جا بسی۔ خوابوں کے ان دو جزیروں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ماں کے گھر میں جب وہ کام کاج سے تھک کر اپنے پلنگ پر لیٹتی تھی، تو ان جانی آرزوں، ان سمجھی اُمیدوں کے تصورات نیا نیا روپ بھر کر اس کی نیند میں گاتے اور ناچتے تھے۔ دن رات خصم خصم کے طعنے سن کر بھی وہ خواب میں چاندنی کی طرح غیر مرئی اور احساس کی طرح موہوم سایوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔۔۔۔۔۔ نئی نویلی دلہن کی طرح جو گھونگھٹ کا پٹ کھولتے ہوئے اس لئے جھمکتی ہو کہ شاید اس کے سامنے زمین نہ ہو، تاروں بھرا آسمان ہی آسمان ہو۔۔۔۔۔۔ اور ایک روز فریدہ سچ مچ کی دلہن بھی بنی۔ کہاروں کی ڈولی نے اسے ایک پلنگ سے اٹھا کر دوسرے پلنگ پر لا ڈالا۔ پہلا پلنگ سادہ تھا۔ دوسرے کے پائے رنگین تھے۔ لیکن ان پلنگوں کے درمیان زندگی کا ایک عزیز سرمایہ لٹ کے رہ گیا تھا۔ ڈیڑھ دو سو براتیوں نے اللہ اور رسول کو بیچ میں رکھ کے اُسے چمکے دیا تھا اور بجھی ہوئی راکھ کا ٹھنڈا بورا، اس کے پتے باندھ کر چلتے بنے۔ اب بڑی آپا کے ہاتھ نچا نچا کر دیئے ہوئے طعنے فریدہ پر منکشف ہونے لگے اور جیون میں خصم ہی خصم کا جوراگ وہ سنا کرتی تھی وہ کلیم اللہ خان لولابی کی عملی شکل میں اس کے سامنے نمودار ہو گیا، سپنوں کی دنیا میں جو رنگ محل اس نے کھڑے کئے تھے، وہ ایک ایک کر کے مسمار ہونے لگے۔ اب اس کے خوابوں میں قوس قزح کے رنگوں کی جگہ اجڑے ہوئے سائے آنے لگے۔ مسرور جھولوں کی جگہ ہچکولے آنے لگے ادھوری خواہشوں کے ہچکولے۔ تشنہ آرزوں کے ناکام آسروں کے ہچکولے۔۔۔۔۔۔

اور پھر ایک دن اس کے خواب میں ڈاگی آیا۔ ڈاگی اس کا چیتا پلا تھا۔ وہ اپنی سنہری بالوں والی دم ہلاتا ہوا لپکا۔ اس نے اپنے اگلے پاؤں فریدہ کی گردن سے لٹکا دیئے۔ ڈاگی خرخر کرتا ہوا جھکا۔ اس کی نرم نرم گرم گرم زبان

فریدہ کی ٹھوڑی اور گردن کو زور زور سے چاٹنے لگی۔ ڈاگی کے وحشی پنجے فریدہ کے تن بدن میں پیوست ہو گئے۔۔۔۔۔۔ ایک بھونچال سا آیا۔ جیسے بہت سے آتش فشاں پہاڑ بھک سے پھٹ گئے ہوں۔ فریدہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے لائیں کی بتی کو اونچا کیا۔ ساتھ والے پلنگ پر کلیم سویا ہوا تھا۔ ہر خرائے کے ساتھ اس کے پیلے پیلے گال پھول جاتے تھے، جیسے کوئی شریر بچہ آم کے چُپے ہوئے چھلکے میں ہوا بھر رہا ہو! کمرے کے ایک کونے میں ڈاگی تھا وہ ایک کھردرے سے ٹاٹ پر سانپ کی طرح کندلی مارے اونگھ رہا تھا فریدہ نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا پھر اس نے دبی زبان سے چُس چُس کر کے ڈاگی کو پکارا۔ ڈاگی نے آنکھیں کھول کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ فریدہ نے ہاتھ پھیلا کر پھر پکارا ڈاگی دم ہلاتا ہوا اٹھا زبان نکال کے لپکا اور فریدہ نے اسے اپنی بانہوں کے درمیان دبوچ لیا!

تین تارے

رانو، نصرت، جوز۔۔۔۔۔ رانو کا پورا نام رنیکا تھا۔ جوز کا جوزفین
نصرت کا نصرت، اگرچہ اس کا نام تو شکست ہونا چاہیے تھا!

صدر بازار میں چوک کے پاس ایک خوانچے والا بیٹھتا ہے۔ وہ لہک لہک کر اپنے گاہکوں کو دعوت دیا کرتا ہے۔۔۔۔۔ تراوٹ میں آئیے! تراوٹ میں آئیے!!“ وہ چار آنے میں تین سنگترے دیتا ہے پاس ہی دوسرے دکاندار چھ پیسے میں دو دو کی پکار لگاتے ہیں۔ لیکن وہ محض سنگترے بیچتے ہیں خوانچے والا طراوت بھی ساتھ دیتا ہے! میں پوچھتا ہوں نام میں کیا نہیں ہے۔

اگر اس کا نام فقط مس شاکرداس ہوتا تو لوگ آتے بیٹھتے، ہنستے، کھیلتے اور چلے جاتے اگر اس کا نام صرف جوزفین ہوتا تو آتے، بیٹھتے، ہنسنے کھیلنے کے عمل میں شاید بالشت ڈیڑھ بالشت کا اضافہ ہو جاتا۔ لیکن جب کسی نے تعارف یوں کروایا، کہ یہ مس شاکرداس ہیں، مس جوزفین شاکرداس ”تو لمحہ بھر کے لئے یہ محسوس ہوا گویا رڈ یارڈ کپلنگ اور مرزا غالب گلے مل کر زار و قطار رورہے ہیں۔

”جی ہاں، جوزفین۔“ اس نے اپنی پلکوں پر حیا کا بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”لیکن گھر میں مجھے سب جوزفین کہتے ہیں۔“

بال روم کا آرکسٹرا ایک نشیلی دھن بجا رہا تھا۔ نیلے جوڑے مستانہ وار ناچ رہے تھے۔ میں نے جوز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر کہا کہ اس نام میں ترنم،

جب ہم دوبارہ ناچنے کے لئے اُٹھے، تو ہمارے درمیان سے اجنبیت کا

اس کی آنکھوں میں کچھ عجب رس تھا۔ ایک اتھاہ گہرائی۔ جیسے کنول کے کٹوروں میں شراب چھلک رہی ہو۔ ایک روز ریڈ کراس فنڈ کے لئے کھیل ہو رہے تھے۔ گھوڑ دوڑ ہوئی۔ سائیکل ریکشاؤں کا مقابلہ ہوا۔ فینسی فنٹ بال کھیلا گیا۔ اور آخر میں میوزک کانفرنس منعقد ہوئی۔ سب سے اچھا گانا کملادھینگرا کا تھا۔ اس نے اپنے گلے کا سارا نور مالکوس کی راگنی میں بھر دیا۔ رانو اگلی صف میں بیٹھی تھی۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر تھا۔ کملادھینگرا کی تھی۔ اس کی سُریلی تانیں رس اور مٹھاس کی چاشنی بن کر ہلکی ہلکی پھوار کی طرح منتشر ہو رہی تھیں۔ سُر اور تان کے اتار چڑھا کے ساتھ کنول کے کٹوروں میں پھریریاں اٹھتی تھیں، اور کملادھینگرا کے گیت رانو کی آنکھوں میں لہریں

بن بن کر رقص کر رہے تھے۔۔۔۔۔

رانو کی آنکھوں میں ایک جھنکار سی آگئی۔ اور وہ کملا کے گانے کے ساتھ ساز کی طرح آویزاں ہو گئیں۔ جب کملا کو انعام کا تمغہ ملا تو میں نے ہولے سے زیر لب کہا۔ کہ اس کی اصلی حقدار تو رانُو ہے!

”جی؟ وہ چونکی۔ ”لیکن میں نے گانا تو نہیں گایا۔“

”موسیقی صرف آواز ہی میں نہیں ہوتی!“ میں نے اس کی رقصندہ آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شرما گئی۔ رانو کی آنکھوں کی پلکوں میں میرے لئے ایک دنیا سی آباد ہو گئی تھی۔ زمین اور آسمان کی ہر چیز پر کنول کے پھول کھلے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن اس نئی دنیا کے وجود پر ہمیشہ ایک کرا سا چھایا رہا۔ ایک خاموش غبار سا جیسے کسی رنگ محل کے اُونچے اُونچے کلس بادلوں کے اوٹ میں چھپے ہوئے ہوں۔ کچھ ایسی بات تھی کہ میں نے کبھی رانو سے یہ نہ کہا کہ اس کی آنکھیں خوبصورت ہیں۔ میں نے کبھی اس کو یہ نہ بتایا کہ اسکی گھنی پلکوں کے سائے میں ایک ننھی سی دنیا تعمیر ہو رہی تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا کہ ہم دونوں سمندر کی لہروں کی طرح ایک ہی ساحل کی طرف جارہے تھے۔ وہ مجھے ایک بار بھی نہ بتا سکی کہ ہمارے دل کی دھڑکنوں نے چوری چوری ایک چھوٹا سا آشیانہ بنا لیا تھا۔۔۔۔۔ ہم وقت کے پردے میں خاموش دھماکے سنتے رہے۔ دو برس تک ہم ایک دنیا میں رہے لیکن متوازی خطوط کی طرح الگ الگ۔۔۔۔۔ ایک ہی کشتی میں سوار، لیکن دریا کے کناروں کی طرح جدا جدا۔ ہر روز ہم ملتے تھے۔ کبھی کلب میں۔ کبھی سنیما میں۔ کبھی گھر میں۔ کبھی یہاں۔ کبھی وہاں۔۔۔۔۔ اور گھنٹوں ہم کھیلتے تھے۔ کبھی پنگ پانگ۔ کبھی ٹینس۔ کبھی تاش۔ کبھی کیرم۔۔۔۔۔ ایک روز ٹینس کھیلتے کھیلتے اس کے پاؤں میں موج آگئی۔ مجھ سے یہ بھی نہ ہوا کہ اسے سہارا دے کر کرسی تک لے جاؤں۔ کلب کے دو بیروں نے اسے اٹھا کر کوچ پر لٹا دیا اور پھر ایک روز تاش کھیلتے کھیلتے میز کے نیچے اچانک ہمارے پاؤں ایک

دوسرے کے ساتھ ٹکرا گئے۔ ہم نے اٹھ کر ایک دوسرے سے معافی مانگی۔ لیکن ہمارے دل یہی کہتے رہے کہ تم دونوں جھوٹے ہو۔ چور ہو۔ تم تو چاہتے تھے کہ وہ مختصر سا لمحہ غیر فانی ہو کر کائنات پر چھا جائے۔ اور اب تم معذرت کرتے ہو۔ جھوٹے مکار۔۔۔۔۔ اور اس جھوٹ کی سزا انجام کاریہ ملی کہ رانو کا ایک جگہ بیاہ ہو گیا۔ ہونا ہی تھا۔ لیکن ہمارے درمیان آرزوؤں کی جو ایک خوشنما ٹیکسلا مسمار ہوئی تھی اسے ابھی تک کوئی کھود نہیں سکا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کھکشاں کی پھلواری میں ایسے تارے بھی تو ہیں، جو صرف نظر آتے ہیں، ہاتھ نہیں آتے۔ لیکن نصرت کا وجود رانو اور جوز دونوں سے الگ ہے۔ وہ اس تارے کی طرح ہے جس کی روشنی ابھی زمین تک نہیں پہنچی۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے آج تک نصرت کو نہیں دیکھا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کا اصلی نام شکست ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ وہ جو کچھ بھی ہے، جہاں کہیں بھی ہے ایک لڑکی ہے۔ شاید وہ جوان ہو۔ شاید وہ خوبصورت ہو۔۔۔۔۔ لیکن مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ کون ہے اور کیسی ہے۔ مجھے تو یہ معلوم ہے کہ وہ ہے اور ابد تک رہے گی۔ اسے ابد تک رہنا ہی چاہئے۔ مگر اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اُسے ابد تک رہنا ہی چاہئے مگر اس کے چاہے یا نہ چاہے سے کیا ہوتا ہے؟ اسے تو ابد تک رہنا ہی پڑے گا۔ وہ بنی نوع انسان کا عزیز سرمایہ ہے۔ وہ لٹ سکتی ہے۔ لٹا سکتی ہے۔ لیکن وہ مٹ نہیں سکتی۔ شاید وہ مٹا سکتی ہو، لیکن لالے کا داغ نہ آندھی نے مٹایا ہے نہ کالی گھٹاؤں نے۔ بچاری نصرت کی کیا بساط ہے۔۔۔۔۔ جب کہ اس کا نام ہی شکست ہو! کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ محض عورت ہے۔۔۔۔۔ یعنی مرد کی ایک آدھ حاجت روا کرنے والی بے ذائقہ سی دوا۔۔۔۔۔ جیسے قبض کے لئے کسٹرائل، یا کھانسی کے لئے جوشاندہ۔ کبھی خیال آتا ہے کہ شاید وہ عورت نہ ہو، محبوبہ ہو۔ ان دونوں بہنوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک آرزوؤں کو پورا کر کے مٹا دیتی ہے۔ دوسری تمناؤں کے ان مٹ جزیرے آباد کیا کرتی

پہلی تنخواہ

تین سو ننانوے روپے پندرہ آنے۔۔۔۔۔ ایک آنہ رسید کے ٹکٹ کا کٹ گیا۔ ورنہ پورے چار سو ہوتے۔ رویش نے نوٹوں کا پلندا سنبھال کر جیب میں ڈالا، اور خزانچی کے زمین دوز سلام کا جواب گردن کی ایک رعوت آمیز جنبش سے دے کر خزانے سے باہر نکل آیا۔ اس کے دل میں رسید کا ایک آنہ کٹ جانے کا درد تھا۔ ورنہ اس کی جیب میں اب تین سو ننانوے روپے پندرہ آنے کی جگہ پورے چار سو روپے ہوتے۔ کل چار سو روپے، اور دنیا بھر کا خرچ۔ اُف! یہ سرکار بھی کیا مضحکہ خیز حرکتیں کرتی ہے۔ میرے دستخطوں پر ایک پورے دفتر کا کام چلتا ہے۔ لیکن جب تنخواہ کے چار سو روپوں کی بات ہو تو ایک آنہ رسید کا ضرور کٹے گا۔۔۔۔۔ چہ، رویش نے غصے سے خزانے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جو پھانک کے پاس کھڑا اسے جھک جھک کر سلام کر رہا تھا۔ جیسے بخشش کی ایک چوٹی پر اس کا پیدائشی حق ہے۔ لوگوں نے بھی کیا کیا واہیات رواج بنا رکھے ہیں۔ بیکار۔ فضول۔ جیسے وہ اُلٹو کا پٹھا کوئی تنخواہ ہی نہیں پاتا۔ یہی بخشش تو رشوت کا پہلا سبق ہے۔۔۔۔۔ بچ گیا شیطان۔ اگر منہ سے کچھ مانگتا، تو رپورٹ ہو جاتی سالے کی۔۔۔۔۔

راستہ بھر رویش مسکراتا رہا۔ ہنستے کھیلتے چہرے، بھڑکی دکانیں، چمکیلے لباس۔۔۔۔۔ زندگی میں مسرت کی چاندنی، خوشی کی لہریں۔۔۔۔۔ واہ! کیا کتنا۔۔۔۔۔ جب وہ اپنے نئے فرنشڈ گول کمرے میں بیٹھ کر چائے پینے لگا تو

لیکن منزل تو دونوں کی ایک ہے۔ عورت یا تو خود تھک ہار کر پلنگ پر جاگرتی ہے، ورنہ اسے چوٹی سے پکڑ کر گرا لیا جاتا ہے۔ لیکن محبوبہ کی مسافت ناز کے سارے طے ہوتی ہے۔ وہ تمناؤں کی کشتی میں سوار ہوتی ہے۔ دل کی دھڑکنوں کے ہچکولے اُسے جھولا جھلاتے ہیں۔ لیکن اس کے رومانوں کی پرواز بھی اپنی روائتی پلنگری کے پاس جا کے ختم ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ نصرت عورت بھی نہیں، محبوبہ بھی نہیں، محض نصرت ہے۔ یعنی جس کا نام شکست ہونا چاہیے تھا۔ میں تصور ہی تصور میں اپنے ویرانوں کو نصرت سے آباد کر لیتا ہوں۔ ایک معمولی سی، آوارہ سی غمدیدہ لڑکی۔ جسے اپنے پاس بٹھا کے یہی جی چاہے کہ صرف باتیں ہی کئے جاؤ۔ غم کی باتیں الم کی باتیں۔ شکست کی باتیں۔ فلسفہ نہ سہی۔ ادب نہ سہی۔۔۔۔۔۔۔ نہ قہقہے ہوں۔ نہ راز ہو۔ نہ نیاز ہو۔۔۔۔۔۔۔ فقط نصرت ہو۔ اور اس کی باتیں۔ جب اس نے پہلی بار محبت کی۔ جب اس کی محبت کے آگینے پہلی بار چور ہوئے۔ جب اس نے دوسری بار محبت کی۔ جب اس کی محبت کے آگینے دوسری بار چور ہوئے۔ جب اس نے تیسری بار۔۔۔۔۔۔۔ لیکن میں بہک رہا ہوں میں باتوں ہی باتوں نصرت کے چھپائے ہوئے راز فاش کر رہا ہوں۔ شاید نصرت مجھے کبھی معاف نہ کرے گی۔۔۔۔۔۔۔ لیکن نصرت تم جانتی ہو، میں بالکل بے ریا ہوں۔ مجھے نہ عورت کی تمنا ہے، نہ محبوبہ کی۔ میں تو نصرت کو چاہتا ہوں، خواہ وہ شکست ہی کیوں نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔ جو گوشت اور پوست کی خواہشوں سے بے نیاز ہو کر کسی کو اپنا سکے۔۔۔۔۔۔۔ بہن کی طرح۔ ماں کی طرح ساتھی کی طرح۔۔۔۔۔۔۔ لیکن عورت کی طرح نہیں۔ محبوبہ کی طرح نہیں۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ شکست کی طرح!

اسے ایک بچپن سا احساس ہو لے ہو لے ستانے لگا۔ اس نے سوچا کہ آج اس کی کوٹھی کچھ خالی خالی سی نظر آتی ہے۔ کمروں کا فرنیچر خوشنما تھا احمری پردے نفاست سے لٹکے ہوئے تھے۔ گلدانوں میں پھول تھے۔ الماریوں میں کتابیں۔ میز پر نئے رسالے۔ آتشدان کے بائیں کونے میں ٹیگور کا مرمرین مجسمہ۔ دائیں کونے میں تانبے کا ننھا سا دھڑکا ہوا کیوپڈ۔۔۔۔۔۔ لیکن ان پر ویرانی سی برس رہی تھی۔ جیسے کوئی ضروری چیز کھو گئی ہو۔ جیسے ایک بے پایاں، بے کنار خلانے سارے گھر کو نگل لیا ہو۔۔۔۔۔۔ رویش ایک صوفے سے اٹھ کر دوسرے پر جا بیٹھا۔ وہاں سے کرسی پر آگیا۔ پھر میز پر۔ پھر آتشدان کے پاس۔ ابھی یہاں۔ ابھی وہاں۔ وہ بے چین تھا۔ وہ تلملا رہا تھا۔ اُسے غصہ آنے لگا۔ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟ خالی ڈھول کی طرح۔ ڈھم، ڈھم، ڈھم، ڈھم، تھپ، تھپ، تھپ، تھپ۔۔۔۔۔۔ نہ اس کے ساتھ شہنائی کی گت۔ نہ ستار کا الاپ۔ یہ خالی خولی کمرہ۔ یہ ویران صوفے۔ یہ اجڑی ہوئی فضا۔۔۔۔۔۔ کیوں نہیں کوئی اس کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھتا؟ جس کی مسکراہٹوں کے پھول ان گلدستوں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوں۔ جس کے نفرتی قمقمے کمرے کی بے معنی خاموشی میں چاندی کی گھنٹیوں کی طرح بجنے لگیں۔۔۔۔۔۔ جوندی کی نروں کی طرح مچل مچل کر بھاگے۔ رویش جیب سے نوٹوں کے پلندے نکال نکال کر اس کے منہ پر مارتا جائے۔۔۔۔۔۔ سارے کمرے میں نوٹ ہی نوٹ بکھرے ہوئے ہوں۔۔۔۔۔۔

”حضور، اس خط پر ٹکٹ کم ہے۔ ڈاکیہ ایک آنہ مانگتا ہے۔“ رویش کے نوکر نے ایک بو جھل سا لفافہ لا کر دیا رویش نے دستخط پہچان کر خط کو ہاتھ میں تولیا۔ اس کے کندھے بیزار کن تھکاوٹ سے سکڑ گئے۔ اونہ، پنشن پانے کے بعد پتاجی تو بالکل ریکار ہو گئے۔ لیکن انہیں اتنا بھی خیال نہ آیا، کہ بچارا بیٹا نیا نیا ملازم ہوا ہے۔ اسے اتنے لمبے چوڑے خط پڑھنے کی فرصت کہاں؟ ان کی بلا سے۔۔۔۔۔۔

رویش نے سگار سلگا کر لفافہ کھولا اس میں بہت سے خط تھے۔ مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے۔ چہ خوش! رویش نے لمبے لمبے کش لگائے۔ اب تو گھر کا گھر خط لکھنے کا شوقین ہو گیا ہے!

پہلا خط رویش کے پتا کا تھا۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہی پرانی، باسی باتیں۔ ”صحت کا خیال رکھنا۔ دوسرے تیسرے روز کونین کی ایک گولی کھا لیا کرو۔۔۔۔۔۔ شام کے وقت لمبی سیر کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔۔ سورج نکلنے سے پہلے تھوڑی سی ورزش ضروری ہے۔۔۔۔۔۔“ جیسے یہ باتیں کوئی اور جانتا ہی نہیں! دوسرا خط ماتاجی کا لکھا ہوا تھا۔ ”پر ماتا نے بڑی مرادوں کے بعد یہ دن دکھایا ہے۔ بیٹا، کل تمہیں پہلی تنخواہ ملے گی۔ ایسور تمہیں دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔ پہلا کام یہ کرنا کہ شوجی کے مندر میں پھول چڑھا کے تین براہمنوں کو بھوجن کھلانا۔۔۔۔۔۔ محلے کے یتیم بچوں کو کپڑے بنوا دینا۔۔۔۔۔۔ دان پن میں بڑا آئندہ ہوتا ہے، بیٹا۔۔۔۔۔۔ میں بھی اگلے مہینے ضرور اپنے بیٹے کے پاس آؤں گی۔۔۔۔۔۔ پر ماتا کا کتنا شکر ہے۔۔۔۔۔۔“ ماتا بھی کیا دقیانوسی باتیں کرتی ہے! مندر میں چڑھاوا، براہمنوں کو بھوجن یتیموں کو خیرات۔۔۔۔۔۔ چھی! ماتا کو کیا معلوم کہ ابھی اگلے روز رویش نے انسداد گداگری کے جلسے میں کرسی صدارت کو زینت بخشی تھی۔۔۔۔۔۔ اُف دنیا بھر کے بکھیرے اور ایک آنہ کم چار سو روپے نقد۔ وہ خیر ہوئی کہ خزانے کا چہرہ اس کچھ ہلچکا گیا، ورنہ ایک چونی اور نکل جاتی۔ اور پھر ماتاجی ہیں، کہ خود بھی یہاں آنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ خواہ مخواہ۔ جیسے پتاجی کے پاس انہیں بے حد تکلیف ہے! بڑھاپے میں سفر کرنا بھی تو ایک زحمت ہے۔ ایک کمرے کا فرنیچر درہم برہم کر کے ان کی پوجا کا انتظام ہو گا۔ وہ کیک، گوشت، انڈوں پر کس قدر ناک بھوں چڑھائیں گی۔ اور پھر ان کی سیاہ کنارے والی سفید دھوتی۔۔۔۔۔۔ میں کتا ہوں، اس روشنی اور تہذیب کے زمانے میں ایسی پرانی اور دقیانوسی باتیں۔۔۔۔۔۔ تیسرا خط شاننا کی طرف سے تھا۔۔۔۔۔۔ ”بھیا ہماری چیزیں نہ بھول

رومیش نے ایک بار پھر اپنے ویران کمرے پر اچھتی سی نگاہ ڈالی۔ اور وہ خلا جو آج یکایک وہاں پیدا ہو گیا تھا اُسے اور بھی بے تاب کرنے لگا۔ سامنے پٹیل صاحب کی کوٹھی تھی۔ باغیچے میں رنگارنگ کے پھول لہلہا رہے تھے ننھی

شاننا اور اس کی فرمائشیں! رو میٹھ نے سوچا، وہ روز بروز کتنی آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ جب دیکھو بناؤ سنگار کا بھوت سر پر سوار ہے۔ چمپر، بار جٹ، رُوج، لپ سنگ۔۔۔۔۔ کم بخت ماتا جی کی مثال سے بھی سبق نہیں لیتی۔ وہ اپنی سادگی میں کس قدر خوش ہیں۔ ان کی زندگی کیا بے فکری سے گزرتی ہے۔۔۔۔۔ خوب! چمپا نے انز میڈیٹ کا امتحان بھی دے دیا ہے! اب تو بڑی ہو گئی ہوگی۔۔۔۔۔ اور یہ شاننا ابھی تک انزس میں لٹکی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ کس قدر شوخ ہوا کرتی تھی چمپا! اب اس نے انز میڈیٹ کا امتحان بھی دے دیا ہے! چمپا! نام کچھ کچھ چنبیلی کے وزن پر ہے۔۔۔۔۔ جیسے کلیاں! مسکراتی ہوئی کلیاں! میں اسے ضرور ایک تحفہ بھیجوں گا۔۔۔۔۔ چمکتا ہوا سنگاروان؟ کالے اور پیلے اور نیلے بلاوز؟ مرمر کا کیوپڈ؟۔۔۔۔۔

رو میٹھ نے چوتھا کانڈ نکالا، تو اسے دستخط پہچاننے میں دقت ہوئی۔

کلامالی کی قینچی ہاتھ میں لئے پودوں کو قطع و برید کر رہی تھی۔ رویش کو کھڑکی میں دیکھ کر وہ مسکرائی، اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ادب سے سلام کیا۔

----- رویش کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی جیب کی طرف اٹھا، اور نوٹوں کے پلندے کے پاس جا کر رک گیا۔-----
اوہ! اس نے سوچا، کلاما کس قدر بڑھ گئی ہے! ابھی کل تو بچہ نظر آتی تھی۔----- اے کاش! آج پھر وہ میرے پاس سنگترے کے بیج مانگنے آئے۔-----

رویش کا جی چاہتا تھا، کہ وہ اپنے ویران ماحول سے فرار ہو کر اور کہیں نہیں تو پکھری کے کمرے میں چلا جائے۔ اور عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مقدموں، مسلوں اور فیصلوں میں کھو جائے۔----- شاید آج وہاں پھر وہ بڑھیا آئے جس کا بیٹا چوری کے الزام میں حوالات میں بند تھا۔ شاید اس کے ساتھ اس کی بہو بھی ہو۔----- وہ نوجوان، شرمائی ہوئی غم دیدہ لڑکی جو اس روز تنہا رویش کی کوٹھی پر اپنے پتی کو چھڑانے آئی تھی۔ جب وہ زبان سے رحم کی زکوٰۃ نہ پاسکی، تو غالباً رشوت کے طور پر اس نے اپنا گھونگھٹ الٹ دیا! ایک برق نما چہرہ اس کے دامن پر تڑپ کے گرا۔ وہ دم بھر کے لئے دو تیرتی ہوئی سیلاب زدہ آنکھوں میں ڈوب گیا۔----- آہ، یہ قوف رویش! آج سے چند روز پہلے وہ ایک جذباتی گدھا تھا۔ انصاف! اصول! سچائی! اخلاق!-----
اونہ دنیا نے بھی کیا کیا ڈھونگ بنا رکھے ہیں۔ اس روز وہ خوبصورت لڑکی مایوس ہو کر لوٹ گئی۔ اے کاش، ایک بار پھر وہ اپنا پتی جیل سے چھڑانے آئے۔ صرف ایک بار۔-----

رویش نے بے تاب ہو کر کھڑکی بند کر دی۔ اور کمرے کی بے کیف خاموشی سے گھبرا کر باغیچے میں آگیا۔ سامنے مالن مرغیوں کو دانے بکھیر رہی تھی۔ اس کی سیاہ رنگت میں پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور وہ اپنے موٹے موٹے، بھدے سے ہونٹ پھلا کر مرغیوں سے کچھ مسمل سی باتیں کر رہی

تھی۔ رویش ذرا زور سے کھانسا اور نوٹوں کا پلندا جیب سے نکال کر ہوا میں اچھالنے لگا۔----- مالن نے نظر اٹھا کر غور سے دیکھا، جھک کر سلام کیا، اور مرغیوں کو اپنے آگے لگا کر دوسری طرف چلی گئی۔----- غوں۔-----
غوں۔----- غاں۔----- مالن مرغیوں سے اسی طرح پیار کرتی جا رہی تھی۔ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔----- کوئی بھی نہیں۔----- رویش نے سوچا، اس مطلب پرست دنیا میں کوئی بھی کسی کی پروا نہیں کرتا۔----- اور پھر سارا زور لگا کر اس نے نوکر کو پکارا۔

”چندو، وہاٹ ہارس کی ایک بوتل۔----- انگریزی شراب کی دکان سے۔----- فوراً۔-----“

چندو اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ جیسے اسے پچھو نے ڈس لیا ہو۔ فرط حیرت سے اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔
”تم جانتے کیوں نہیں؟“ رویش کڑک کر بولا۔ ”میری طرف گھور کیا رہے ہو۔----- حرامزادے۔-----“

صبح صادق کے جھپٹے میں چندو نے سنگار میز پر حجامت کا سامان لگا کے رکھ دیا۔ رویش ایک صوفے پر اوندھا پڑا تھا۔ سامنے تپائی پر وہاٹ ہارس کی خالی بوتل تھی۔ احمری پردوں سے چھن چھن کر آنے والی چند مدھم سی شعاعیں کمرے میں تھر تھرا رہی تھیں۔ ننھی، بدلا کا خط صوفے کے پاس گرا پڑا تھا۔ اور اس کے قریب رویش کی پہلی تنخواہ۔-----

کے دل کو جنسی محبت کے آتشیں جذبات سے خالی رکھتا ہے۔ اس عمر کے بعد جب بڑھتی ہوئی دوشیزہ کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تیز ہونے لگتی ہے، اور اس کی رگوں کا خون تازہ حرارتوں سے گرم ہونے لگتا ہے۔ تو ایک لطیف رات، جبکہ چودھویں کا چاند سوئی ہوئی امنگوں کو جگاتا ہے، خداوند لہا کسی تمثیلی خواب کے ذریعے اس کی جوانی کی لہروں کو متلاطم کر دیتا ہے۔ نودمیدہ دوشیزہ کے لئے یہ سہاگ کی پہلی رات ہوتی ہے۔ کیونکہ اس شب، خداوند لہا کے حکم سے، وہ خواب میں کسی فوق الفطرت روحانی طاقت کی عروس بنتی ہے۔ لیکن صنم ہلکیت کا خواب سن کر بوڑھی کلرانگ ڈولا کچھ افسردہ ہو گئی۔ کیونکہ صنم ہلکیت کے خواب میں جو دو لہا آسمان سے اُترا، وہ مضطرب لہروں کی طرح کوئی ضیاء پاش تجلی نہ تھی۔ بلکہ ایک حسین، بیحد حسین، نوجوان تھا۔ جس کا کشادہ سینہ گرتی ہوئی آبشار کی شفاف آبی چادر کی طرح خوبصورت تھا جس کی پیشانی چودھویں کے چاند سے بھی پُر نور تھی۔ صنم ہلکیت کے شرمائے ہوئے گالوں پر اس نوجوان نے گرم گرم بوسوں کا مینہ برسایا۔ اور پھر اس کی لہراتی ہوئی چوٹی کو اپنی گردن میں ڈال کر ناپنے لگا۔ لیکن جب بادلوں کے فرش پر، بجلی کے تاروں سے بنی ہوئی عروسی سچ عشق بیتاب کو حسن کی سکوں پر در چاندنی میں سلانے والی تھی۔ تو آہ! وہ دلربا نوجوان ہلکیت کے پہلو سے غائب ہو گیا۔۔۔۔۔ ”ماں، جس طرح چاند کی کرن بادلوں میں کھو جائے۔۔۔۔۔“

مقدس ماں! جیسے پانی کی لہر چل کر مٹ جائے، اور۔۔۔۔۔ اور پھر نہ ملے۔۔۔۔۔“

کلرانگ ڈولما دونوں ہاتھوں سے اپنا کپکپاتا ہوا سر تھامے متفکرانہ سوچ میں غرق بیٹھی تھی۔ کمرے کا چراغ پھر اپنی آخری سسکیاں لے رہا تھا۔۔۔۔۔

اور صنم ہلکیت کے لمبے لمبے بے قرار سانس میں لپٹی ہوئی ایک دھیمی سی آواز کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔ ”معبود پیوس کی اچھی ماں! یہ میٹھی میٹھی خلش کیا ہے؟ جس طرح ننھی ننھی بوندیں تالاب میں گر کر بلبلوں کی ہلکی ہلکی لہریں بناتی ہوں۔۔۔۔۔“

”تم جا کر سو جاؤ بیٹی،“ آخر کار ڈولما نے صنم ہلکیت کی طرف حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”گھر جا کر سو جاؤ۔۔۔۔۔ دو روز کے بعد گوپہ ماٹھو کا نگرانگ ہو گا۔ وہاں جا کر مقدس لہا سے پوچھنا کہ تمہارا خوبصورت نوجوان کہاں ہے۔۔۔۔۔“

گوپہ ماٹھو کا سالانہ میلہ نگرانگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس روز تین ریاضت اور چلہ کش عالموں پر لہا یعنی دیوتا کا ظہور ہوتا ہے۔ اور وہ زائرین کے سوالوں کا جواب دیتے اور ان کی مرادوں کا نتیجہ بتاتے ہیں۔۔۔۔۔

گوپہ کے دروازے کے سامنے ایک کھلا صحن تھا جس میں برآمدے بنے ہوئے تھے۔ ایک برآمدہ میں کوشوک (گوپہ کے سب سے بڑے لامہ کا لقب) اور دوسرے لامہ درجہ بدرجہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ڈھول، ٹرہی، جھانج، اور سرنائی بجانے والے لامہ قطار در قطار بیٹھے تھے۔ پوستینوں اور چوغوں میں لپٹے ہوئے زائرین کا ہجوم، گردن جھکائے، خاموش اور ساکت بیٹھا تھا۔ لیکن زنانہ برآمدے میں دھیمی دھیمی باتوں کا ہلکا سا شور ہو رہا تھا۔ ضعیف العمر، بوڑھی عورتیں اور نوجوان لڑکیاں، اپنی اپنی لڑکیاں، اپنی اپنی مرادوں کو سینے میں چھپائے لہا کے ظہور کے لئے بے تاب تھیں۔ کالے رنگ کی خوشنما پیشواؤں کے اوپر انہوں نے بکری کا چمڑا، بالوں کو اندر کی طرف رکھ کر، اوڑھا ہوا تھا۔ ان کے سر پر قسم قسم کے پیراک نئی بہار دکھا رہے تھے۔ پیراکوں میں چاندی سونے کے زیورات اور فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی نوک پیشانی کے اوپر تھی۔ اور یہاں سے، کانوں سے لپٹی ہوئی پیٹھ تک چلی جاتی تھی۔ لیکن صنم ہلکیت کے سر پر کوئی پیراک نہ تھا۔۔۔۔۔ ایک جوان حسینہ کا اس ضروری زیور کے بغیر برسر عام آنا، اور جذبات کی شدت سے ہانپ ہانپ کر، وحیانہ آنکھوں سے مردوں کے مجمع کی طرف دیکھنا سب کی نفرت اور

”----- یہ سب ضد ہے“ وہ اپنا کانپتا ہوا سر ہلا کر پڑا سرار لہجے میں کہا کرتی تھی----- ”سب ضد کا نتیجہ----- ہی ہی ہی----- خداوند لہا سے ضد! جب تک روحانی نوجوان نے ضد کی کہ وہ صنم ہلکیت کے حسن کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنا کر لے، اس وقت تک وہ اپنی محبوبہ کے پہلو میں تشنہ کام و تشنہ روح تڑپتا رہا----- ہی ہی ہی----- اور جب صنم ہلکیت نے ضد کی کہ اس کے پہلو والا خوبصورت جوان اسے مل جائے، تو وہ پتھر بن گئی، اور روحانی جوان انسان بن گیا----- ضد؟ بیوقوف لڑکی----- مجھے معلوم تھا----- معبد پیوس میں جلنے والے چراغ کے مکھن کی قسم----- آسمان سے ضد؟

سٹینوگرافر

یہ شاید اس کا پہلا شعر تھا۔
 ”میرے سپنوں کے باغ میں دبے پاؤں کون آیا؟ مالی! اسے تھام لے!
 وہ میرے شبنم کے موتی چرا رہا ہے!“
 ٹائپ کئے ہوئے کانڈوں کے پلندے میں شاید وہ اپنا پرائیویٹ نوٹ پیپر رکھ کے بھول گئی تھی۔ میں نے میز کی گھنٹی بجا کر اسے بلایا۔
 ”دیکھو گریسی، یہ شاید تمہارا کانڈ ہے۔“
 ”لیس سر“ وہ جھپٹی، اور پھر اس کا گلا بھر آیا۔ جیسے میں نے اس کی ٹائپنگ میں ہزاروں غلطیاں پکڑ لی ہوں۔ ”سوری سر۔ میری بھول سے دوسرے کانڈوں میں چلا آیا ہے۔“
 ”جب تمہاری غزل پوری ہو جائے مس، تو مجھے دکھانا!“ میں نے مذاقاً کہا۔

اس نے ٹرے کی فائلوں کو اکٹھا کیا اور جلدی سے نکل گئی۔
 اس روز شاید وہ سارا دن اپنی مکمل ہونے والی غزل میں کھوئی رہی۔
 صبح میں نے کئی ضروری سرکلر لکھائے تھے۔ وہ شام تک ٹائپ کر کے نہ لائی۔

میں نے بلا کر پوچھا ”سب کانڈ ضروری ہیں مس۔ ابھی ختم نہیں ہوئے؟“

”سوری سر۔ میں فوراً آتی ہوں“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔
 ”اور غزل؟“ میں نے طعنہ دیا۔

میرا خیال ہے، میرے اس طنز سے اس کے دل پر چر کا سا لگا۔ غالباً وہ اس اچانک چوٹ کے لئے تیار نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد چہرہ اسی ساری ٹائپ شدہ فائلیں لے آیا۔

عموماً مجھے اس بھولی سی لڑکی پر ترس آتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تیر کی طرح سیدھی اور بے بل تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سکول کا نیلا فرائم پہن کر دفتر آیا کرتی تھی۔ اب تک اس میں کلاس روم کی عادتوں کا پرتو تھا۔ سکول کی لڑکیوں میں جو لہجہ سی بے باکی ہوتی ہے، گریسی میں ابھی اس کو فائلوں کے انبار نے پائمال نہیں کیا تھا۔ ایک دن لکھاتے لکھاتے میں نے گرامر کی غلطی کی۔ گریسی نے ٹوک دیا۔

”دونوں طرح ٹھیک ہے“ میں نے اپنی پوزیشن کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھا!

”نہیں، سر۔ نیلسن کی ہائی سکول گرامر میں اسے غلط ٹھہرایا گیا ہے“
 میں نے ہار مان لی۔ مجھے تلاش کے باوجود بھی اس کے ٹائپ کئے ہوئے پلندوں میں املا کی غلطی نہ ملتی تھی۔ اگر وہ سکول چھوڑنے سے پہلے سینئر کیمرج کا امتحان پاس کر لیتی، تو شاید دفتر میں اسے اگلا گریڈ مل جاتا۔

جب وہ کانغذوں کے ڈھیر میں ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھتی تھی تو یوں نظر آتا تھا جیسے ایک سنجیدہ سے بچے کو زبردستی بزرگوں کے کپڑے پہنا دیئے ہوں وہ بولتی بہت کم تھی۔ میں نے دوچار دفعہ اتفاقاً اسے ہنستے دیکھا تھا۔ ایک بار اس وقت جب کچھ لکھاتے لکھاتے میری پنسل میز سے پھسل کر نیچے جا پڑی، میں نے دونوں پاؤں جوڑ کر کئی بار اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ پھر میں نے گھٹی بجاکر چہرہ اسی کو بلایا۔ اس نے پنسل اٹھا دی۔ گریسی بے اختیار ہنس پڑی۔

”کیا بات ہے مس؟ میں نے پوچھا۔

کچھ نہیں سر۔ مجھے کنگ بروس اور مکڑی کا قصہ یاد آگیا تھا“
 چوٹ برجستہ تھی۔ لیکن مجھے زیادہ نہ بھائی۔ شاید گریسی کو بھی میرے تیور برے لگے۔ لیکن یہ میرا قیاس ہی قیاس ہے۔ کیونکہ اس کا گول گول چہرہ اسہنج کی طرح تھا جس میں جذبات کے پرنا لے بھی ہوں تو نشان چھوڑے بغیر جذب ہو جائیں۔

دوسری بار جب میں نے اسے ہنستے دیکھا، تو نازک موقع تھا۔ اس روز دفتر کی ایک لیڈی اسٹنٹ مس مارگرٹ نے دو ماہ کی چھٹی کے لئے درخواست بھیجی تھی۔ کلرکوں میں کانٹا پھوسی ہو رہی تھی، اور وہ اپنے سکشن کی ٹائپسٹ لڑکیوں کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ لڑکیاں جھوٹ موٹ ٹائپ کی مشینوں پر انگلیاں مار کے ایک بھڑا سا ترنم پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور مارگرٹ کی افسوسناک مجبوریوں پر زہ لب تبصرہ ہو رہا تھا۔ گریسی نہ مسکراہٹوں میں شامل تھی، نہ چہ میگوئیوں میں۔ وہ حسب معمول کانغذوں کا پلندہ لئے کھٹ کھٹ ٹائپ کر رہی تھی۔

”بدمعاش!“ دفتر کے ہیڈ اسٹنٹ امیش بابو نے مارگرٹ کی درخواست پر سفارشی نوٹ لکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اینگلو انڈین چھوکریاں آگاہی چھا تو دیکھتی نہیں، اور پھر دو مہینے کی چھٹی مانگتی ہیں۔ دفتر نہ ہوا، باوا کا گھر ہوا۔ کس نے کہا تھا کہ سالے ٹامیوں کے ساتھ رات دن رکشائیں گھوما کرو۔ امیش بابو نے قلم کان میں گھما کر کچھ ایسی ادا سے کہا۔ جیسے ٹامیوں کی بجائے اگر مارگرٹ اس کے ساتھ رکشائیں گھومتی، تو گویا محفوظ تھی۔

پھر امیش بابو نے کھیانی پٹی کی طرح کن انکھیوں سے گریسی کی طرف دیکھا اور آواز میں لوج پیدا کر کے بولے۔ ”مس گریسی، تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر مارگرٹ کے لئے صرف ایک مہینہ کی چھٹی کی سفارش کردوں تو کام چل جائے گا؟“

گریسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔۔۔۔۔۔ ٹائپ مشین چل رہی تھی۔

”مغرور ہے سالی“ امیش بابو جل کر بولے۔ پھر انہوں نے ٹائپسٹ لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ ”دیکھ لوں گا جب سالی خود اپنی درخواست بھیجے گی“

لڑکیوں نے امیش بابو کی خوشامد کے طور پر ہلکے ہلکے تہققے لگائے۔ گریسی کا منہ تہمتا گیا۔ اس نے دھک سے ٹائپ مشین پرے دھکیل دی۔ اور اپنی فائلوں کا پلندا اٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ دفعتاً کمرے میں سکوت چھا گیا۔ کنفیڈنشل فائلوں کے ٹکڑے دیکھ کر سارے کلرک سہم سے گئے۔ امیش بابو کان میں قلم گھماتے میرے کمرے میں آئے۔ میں نے گریسی کو بلا کر پوچھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”سوری سر۔ مجھے غصہ آگیا تھا“

غصہ! مجھے اس کی آزاد سادگی پر بہت ہنس آئی۔ امیش بابو کھیانے ہو گئے۔ اگلے روز میں نے کئی کلرکوں کو دوسرے سیکشن میں تبدیل کر دیا۔

جس روز شیوگرافر کی اسامی کے لئے انٹرویو ہونا تھا۔ بہت سی لڑکیاں امیدوار تھیں۔ قریباً سب نے اپنے چہروں کو خاص اہتمام سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ ان کی ساڑھیوں اور گاؤنوں میں سلیقے کے بل تھے، جن کے سہارے کمر اور سینے کے خطوط والہانہ طور پر عیاں ہو رہے تھے۔ گریسی نے فقط اپنے سکول کا نیلا فرائک پہنا ہوا تھا۔ اور اس نے ابھی سینئر کیمبرج کا امتحان پاس نہ کیا تھا۔

انٹرویو کے وقت لڑکیاں زبان کی جگہ آنکھوں سے جواب دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ ہر سوال پر انکے ہونٹوں کی گلابی پتیاں ایک لطیف سی مسکراہٹ کو شگفتہ کرتیں، ان کی گردنوں میں ہلکے ہلکے خم اٹھتے، اور وہ اپنی زندگی کی ساری رعنائیوں کو اکٹھا کر کے بولنے کی جگہ گانے کی کوشش کرتیں۔ کسی کو پیانوں میں مہارت تھی۔ کوئی مشاق ڈانسر تھی۔ ایک نے موسیقی کے تمنغے جیتے تھے۔ دوسری تیرنا بہت خوب جانتی تھی۔ جب گریسی کی باری آئی تو

بورڈ کے صدر نے کوالی فیکیشن والا سوال دہرایا۔

”سر شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کرنا جانتی ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

”اور؟“ بورڈ کے ایک ممبر نے کریدا۔

”سر، شارٹ ہینڈ میں میری رفتار بہت تیز نہیں۔ لیکن میں مشق کر

رہی ہوں

”اور کچھ؟“ دوسرے ممبر نے زور دیا۔

”سر، آپ کو شاید شیوگرافر کی ضرورت ہے“ گریسی نے یاد دلایا۔

تڑاخ!۔۔۔۔۔۔ انٹرویو بورڈ کے ممبر گویا ایک دھماکے کے ساتھ پیانو،

اور ناچ، اور گانے کی محفل سے دفتر کے کمرے میں آگرے! معاف نہیں یہ محسوس ہوا، اس چھوٹی سی لڑکی نے ان سب کے کان کھینچ دیئے ہیں۔ انکی بزرگی اور عظمت کو ایک پوشیدہ سا جھٹکا لگا۔ لیکن شاید مجبور ہو کر انہوں نے گریسی کو رکھ لیا۔

جب گانے اور ناچنے اور تیرنے والی لڑکیوں نے دیکھا کہ ایک نئی سی نیلے فرائک والی چھوکری ان پر بازی لے گئی ہے، تو ان کی گردنوں کے لوچ نکل گئے ہونٹوں کی گلابی پتیاں بد نما طور پر بکھر گئیں اور انہوں نے ناک سکیڑ کر سوچا۔ آج یہ بورڈ کے ممبر کیا پچھانیں، بوڑھے، کھوسٹ۔۔۔۔۔۔

جب وہ پہلے روز دفتر میں آئی، تو امیش بابو سب سے اول چیل کی طرح اس پر جھپٹے۔ جس طرح ہر نئی چھٹی کے اوپر والے بائیں کونے پر ان کا چھوٹا سا دستخط ہونا ضروری تھا، اسی طرح ہر نئی ٹائپسٹ لڑکی پر سب سے پہلے جھپٹنا وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ چالیس پتالیس سال کی مستقل گردش میں ان کے اگلے دو دانت اور سر کے بہت سے بال گر گئے تھے۔ لیکن ان کا ایمان تھا۔ کہ ریٹائر ہونے میں آٹھ دس برس باقی ہیں۔ جب سرکار کو خود ان کی جسمانی اور دماغی حالت پر مکمل بھروسہ ہے، تو ان سالی چھوکیوں کے ناک بھوں چڑھانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہاتھ لگ جائے تو رشوت اور عورت ایک برابر ہیں۔۔۔۔۔۔

اور یہ اینگلو اینڈین لڑکیاں تو ہاتھ کا میل ہیں، ہاتھ کا میل----- چلتی کا نام گاڑی ہے بھائی، روپیہ ہو، تو سب حلال ہے۔ چنانچہ بابو امیش چندر ہر مہینے اپنی بالائی آمدنی کا ایک حصہ اس ہاتھ کے میل کے لئے اٹھا رکھتے تھے۔۔۔۔۔۔ یوں بھی ان کے ہاتھ میں زنجیر کے دونوں سرے تھے۔ اگر ان کی چلتی ہوئی گاڑی کو ذرا سا ہچکولا بھی لگے، تو لڑکیوں کی ترقی کے پروانے امیش بابو کی لوہے کی الماری سے گم ہو جاتے تھے۔ انکی چھٹی کی درخواستیں درازوں میں پڑی پڑی گرد سے اٹ جاتی تھیں۔ اور ان کی تنخواہوں کے بل میں غیر حاضریوں کے سرخ سرخ نشان نظر آنے لگتے تھے۔ لیکن اب شاید عمر میں پہلی بار امیش بابو کو محسوس ہوا، کہ ان کی گاڑی کے پتے کے سامنے ایک بڑا سا روڑا آپڑا ہے اس لئے وہ گریسی سے زیادہ خوش نہ تھے۔ وہ جب ان کے سامنے آتی۔ تو ان کے منہ کے بائیں گوشے سے پان کی پیک نادانستہ طور پر بنے لگتی۔ اور ان کے مصنوعی دانتوں کا جڑا انگوروں کی ترشی کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگتا۔

دفتر نہ ہوا، سالا راہب خانہ ہوا!----- امیش بابو عموماً جھلایا کرتے تھے۔ گریسی کے آنے سے ٹائپنگ سیکشن پر سنجیدگی کا موٹا سالخاف گر جاتا تھا۔ جس طرح آدمی رات کے وقت کسی رقص گاہ میں گرجے کا پادری ہاتھ میں انجیل اٹھائے اکھڑا ہو۔۔۔۔۔۔! اس کی زندگی میں ایک سادہ سی، ساکن سی یکسانیت تھی۔ جیسے کلاک کی سوئیاں ۱۲ سے ۱۲ تک ایک ہی دائرے میں گردش کرتی رہیں۔ کلاک کی سوئیاں کہنا بھی غلط ہے، کیونکہ ان کے مدھم مدھم جھٹکوں میں تو زندگی کے پراسرار لمحے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ گریسی تو شاید ایک معمولی سی چادر تھی، جسے ہر صبح دھوپ میں سکھانے کے لئے کھڑکی پر ڈال دیا جائے۔۔۔۔۔۔ اور وہ شام تک لٹکی رہے۔۔۔۔۔۔ دفتر میں جو اور ٹائپسٹ لڑکیاں تھیں۔۔۔۔۔۔ ان کی زندگی میں رنگین چور دروازوں کے کھلے ہوئے پٹ تھے، خفیہ کھڑکیاں تھیں، چھپے ہوئے روزن تھے، لیکن گریسی گویا ایک تاریک قبر میں رہتی تھی۔ کہ جس کے راستوں کو بڑی بڑی ریلیں رکھ کر مسدود

کر دیا ہو۔ دن کے ایک بجے جب لنچ کے لئے گھنٹے بھر کی رخصت ہوتی، تو ریفرشمنٹ روم کی بلوری میزوں کے گرد ایک ایک شمع اور کئی کئی پروانے جمع ہو جاتے۔ امیش چندر اور ان کے ہم خیال بابو اس موقع پر اپنے ہاتھ کا میل شامی کبابوں، مرغ مسلم اور بیڑ کی رنگین بوتلوں کی شکل میں اتار پھینکتے تھے۔ جب ٹائپسٹ لڑکیاں، اور لیڈی کلرکیں واپس لوٹتیں، تو ان کی آنکھوں کے پونے بھاری بھاری ہو کر گرنے لگتے اور بیڑ کا خمار لوریاں بن کر انہیں تھکنے لگتا۔ امیش بابو کو بھی اس وقت گریسی کے ٹائپ رائٹر پر غصہ آتا تھا، کیونکہ اس کی ہلک اس ماحول کی خاموش موسیقی میں مانوس گڑ گڑائیں پیدا کرتی تھیں۔ گریسی کی میز کی دراز میں ایک چھوٹا سا پیکٹ پڑا رہتا تھا، جس میں وہ اپنے لنچ کے لئے چار چھوٹے سے سینڈویچ باندھ لایا کرتی تھی۔ جب شام کے پانچ بجتے تو وہ بچی ہوئی فائلوں کا بنڈل اٹھا کر سائیکل پر جا بیٹھتی تھی۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ میں اسے اپنی کار میں بٹھا کر گھر چھوڑ آؤں۔ لیکن کچھ بات تھی، کہ میری ہمت نہ بندھی جب دوسری لڑکیاں دفتر کے دروازے میں نمودار ہوتی تھیں تو مشتاقانِ یار کا غول ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ کچھ خاکی وردیوں والے ہوتے تھے، کچھ کمپنیوں اور دفاتروں میں کام کرنے والے اینگلو اینڈین چھو کرے! کبھی کبھی ہوٹلوں کے گانڈ اور رقص گاہوں کے دلال بھی اپنا پھندا اٹھائے پہنچ جاتے تھے۔ کسی لڑکی کو رکشا میں جگہ ملتی، کوئی وکٹوریہ میں سوار ہو جاتی، کسی کے لئے ٹیکسی منتظر ہوتی۔۔۔۔۔۔ اور پھر ان کی شام کا آغاز فرپوز میں چائے کے ساتھ ہوتا۔ لائٹ ہاؤس میں سینما، گریٹ ایسٹرن میں ڈنر، ڈانس، اور دسکی کے چچھاتے ہوئے پیگ جذبات کا انگارے۔ آگ۔ دھواں اور رات کے پراسرار سائے۔۔۔۔۔۔ لیکن گریسی کی زندگی میں تو ایک سائیکل تھا۔ جس پر سوار ہو کر وہ تیز تیز چورنگی سے گزر جاتی۔ نیومارکیٹ سے چاکولیت یا ٹانی کا ایک پیکٹ خریدتی۔ اور پھر گورا چند روڈ پر اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں چلی جاتی۔ اس کی زندگی کا سرمایہ جارج تھا۔۔۔۔۔۔ ایک چھوٹا بھائی، جسے قدرت کی

ستم ظریفیوں نے گریسی کی امانت میں دیدیا تھا۔ جب جارج بغل میں کتابوں کا بچہ اٹھائے سکول سے لوٹا۔ تو گریسی کے لئے گویا زندگی کا ایک نیا دن طلوع ہوتا تھا۔ وہ ننھی سی لڑکی اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ جارج کے قدموں میں بچھا دیتی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ساری کائنات سمیٹ کر جارج کی جھولی میں ڈال دیتی۔ گریسی کے ذہن میں اپنے بچپن کے دھندلے سے عکس تیرتے رہتے تھے۔ اس کا باپ کلکتہ کی ایک اسٹیر کمپنی میں ملازم تھا۔ گریسی کو محض اتنا سایا یاد تھا کہ عام طور پر آدمی رات گئے ایک بدست اور مخمور باپ شراب کے نشے میں چور گھر میں آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ گریسی کی ماں کو بغل میں لیکریوں جھنجھوڑنے لگتا جیسے بھوکا کتا ہڈیاں چجوڑ رہا ہو۔ لیکن عموماً وہ آتے ہی غصے سے بے تاب ہو جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں شرارے سے چھوٹنے لگتے، اور وہ شور بے اور گوشت کی پلیٹوں کو اندھا دھند بچاری بیوی کے سر پر دے مارتا تھا۔ کئی دفعہ اس نے گریسی کو بھی پٹا تھا۔ یونہی، بلا وجہ۔ اور گریسی کو اب تک یاد تھا کہ اس کا باپ کئی بار عجیب سی لڑکیوں کو گھر میں لے آتا تھا۔ پیلی پیلی دھنسی ہوئی آنکھیں، زرد گالوں پر سرخی اور پاؤں کے بد نما دھبے، بکھرے ہوئے بال، بانسوں پر ابھری ہوئی نیلی نیلی رگیں۔۔۔۔۔ ایک دفعہ ایک ایسی ہی سُرُخ بالوں والی بد صورت سی لڑکی کئی روز ان کے گھر میں ٹھہری۔ اور جب جانے لگی، گریسی کے باپ نے گھر کے کپڑے، برتن اور زیور اٹھا کے ٹیکسی میں ڈال دیئے، اور اس سُرُخ بالوں والی لڑکی کے بازو میں بازو ڈال کر چلا گیا۔ پندرہ برس سے گریسی کی ماں اُمید کا چراغ جلانے بیٹھی تھی کہ شاید کسی روز آدمی رات گئے ایک بدست شرابی گھر میں آئے اور اس کی ہڈیاں چجوڑ کر رکھ دے۔ اس بچاری کا سر پلیٹوں کی چوٹ سننے کے لئے ترس گیا، لیکن جو ٹیکسی جا چکی تھی، وہ واپس نہ آئی۔ جانے والا اس کی جھولی میں گریسی اور جارج دو نشانیاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ ایک ہسپتال میں نرس بن گئی، اور پندرہ برس تک اس نے اپنی دونوں امانتوں کو سنبھالا۔ ایک دن جب وہ ہسپتال سے نکلی، تو

ایک گذرتی ہوئی ٹرام نے اچانک اُسے کچل دیا۔ اس کا سر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا، لیکن اس کے ہاتھ میں ابھی تک چاکولیٹ کے دو پیکٹ تھے، جو وہ ہر شام گریسی اور جارج کے لئے خرید کر لے جایا کرتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ خدا جانے وہ کونسا ازلی انصاف تھا جس نے یکایک گریسی کو سکول کے کمرے سے نوچ کر دفتر کی میز پر لا بٹھایا۔ وہ ابھی بچہ تھی۔ لیکن جارج کی خاطر اس نے اپنی زندگی کی شاہراہوں کو سمیٹ کر بند کر لیا۔ دفتر سے آتے ہوئے وہ ہر روز جارج کے لئے چاکلیٹ یا ٹانی کا بنڈل لایا کرتی تھی۔ اس کے پاس اپنے سکول کے چند فراک تھے۔ لیکن جارج کے لئے وہ ہر فیشن کے کپڑے سلوایا کرتی تھی۔ اتوار کے اتوار وہ اسے پک تک پر لے جاتی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے وہ سینما چلے جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی ملازم نہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں گھر سنبھالتی تھی۔ رات کے وقت جارج اس سے پریوں اور جنوں اور سمندری ڈاکوؤں کی کہانیاں سنتا تھا۔ اور پھر گریسی دفتر کی بچی ہوئی فائلیں ٹاپ کرنے بیٹھ جاتی۔۔۔۔۔۔۔ زندگی کی اس انتھک گردش میں شاید ایسے لمحے بھی ہوتے تھے، جو اس چھوٹی سی لڑکی کے دل میں سپنوں کے باغ کھلا دیتے تھے، اور وہ کسی دبے پاؤں آنے والے چور سے شبنم کے موتی چھپالیتی تھی۔

گریسی اب بھی شیو گرافر ہے۔ لیکن اب اس کے پاس بہت سے بھڑکیے فراک ہیں۔ شام کے وقت وہ سائیکل پر گھر نہیں جاتی۔۔۔۔۔۔۔ اسے بھی رکشا میں جگہ ملتی ہے یا وکٹوریہ میں یا کسی شاندار ٹیکسی میں۔ اور اب اس کی زندگی میں بھی فرپوز کی چائے ہے۔ لائٹ ہاؤس سینما۔ گریٹ ایسٹرن میں ڈنر۔ ڈانس و سکی کے چچھماتے ہوئے پیگ۔ جذبات کے انگارے۔ آگ۔ دھواں اور رات کے پڑا سرار سائے۔۔۔۔۔۔۔ جارج بھی سیانا ہو گیا ہے۔ وہ آدمی آدمی رات گئے نشے میں چور گھر آتا ہے۔ اور غصے سے بے تاب ہو کر شور بے اور گوشت کی پلیٹیں گریسی کے سر پر دے مارتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ کوئی دھنسی ہوئی آنکھوں والی لڑکی بھی ہوتی ہے۔ پیلے پیلے گال۔ نیلی

رگیں الجھے ہوئے بال۔۔۔۔۔۔ گریسی کے دل میں بہیم ایک زہرناک خدشہ
 لرزتا ہے کہ شاید وہ کسی روز ایک سُرخ بالوں والی لڑکی کے ساتھ ٹیکسی میں
 بیٹھ کر چلا جائے گا۔ وہ اپنی زندگی کی ساری لڑیاں جمع کر کے روپوں کے جال
 بنتی رہتی ہے۔ تاکہ جارج اڑ نہ جائے۔ جارج کو روپیہ چاہیے۔ شراب کے لئے
 روپیہ۔ سیر کے لئے روپیہ شکار کے لئے روپیہ۔ سُرخ بالوں والی بھدی بھدی
 لڑکیوں کے لئے روپیہ۔۔۔۔۔۔ گریسی اس کا ہاتھ خالی نہیں رہنے دیتی۔ وہ روپیہ
 لاتی ہے۔ وہ روپیہ کماتی ہے۔ وہ روپیہ چراتی ہے۔۔۔۔۔۔ دفتر کی تنخواہ سے،
 صاحب کے تحفوں سے، امیش بابو کے ہاتھ کے میل سے، فرپوز سے، لائٹ
 ہاؤس سے، گریٹ ایسٹرن ہوٹل سے۔۔۔۔۔۔

مجھے معلوم نہیں زندگی کی اس سکون پرور آبشار میں یہ جوار بھٹا کیسے
 آیا۔ برسوں سے وہاں میرا تبادلہ ہو چکا تھا۔ چارج دینے سے پہلے میں نے نئے
 صاحب کو دفتر کے عملے سے ملایا۔ جب گریسی کی باری آئی، تو انہوں نے چپکے
 سے میرا ہاتھ اپنی طرف بھینچا، اور زیر لب گنگنائے۔۔۔۔۔۔ گڈ لارڈ پناخہ ہے،
 بھئی پناخہ۔ اس وقت میرے دل میں دفعتاً یہ خوش ابھری، کہ کاش دفتر کی
 چھت پر ایک زبردست بم کا گولہ پھٹ جائے۔۔۔۔۔۔ جب میں ریل گاڑی میں
 سوار ہوا، تو دفتر کا سارا شاف الوداع کہنے آیا ہوا تھا ان میں گریسی نہ تھی۔ مجھے
 بڑی مایوسی ہوئی، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں ضرور میرا احترام
 ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن جب گاڑی اگلے اسٹیشن پر جاڑکی، تو میں نے دیکھا کہ وہ
 پلیٹ فارم پر پھولوں کی چھوٹی سی ٹوکری اٹھائے کھڑی ہے۔ جب اس نے
 پھولوں کا گلدستہ مجھے دیا، تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں
 ننھے ننھے خپروں کا طوفان سا اُٹا ہوا تھا۔ وہ بار بار کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے
 میرا بازو تھام لیتی تھی۔ میں نے اُسے زندگی کے نشیب و فراز پر ایک چھوٹا سا
 لکچر دیا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پتیوں کی طرح تھرتھرا اٹھے، جیسے
 آندھی کے تھپیڑوں نے انہیں اچانک جھنجھوڑ دیا ہو۔

”سر۔ میں کمزور نہیں ہوں۔ لیکن میرے دل میں ایک نامعلوم سا
 خوف سمایا جا رہا ہے۔ سر، مجھے نہیں معلوم کہ میرا دل اس قدر ڈوب کیوں رہا
 ہے سر۔۔۔۔۔۔“ وہ اس سسے ہوئے بچے کی طرح میرے قریب کھسکتی آرہی
 تھی، جسے ایک گہری اور تاریک کھائی کے سرے پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا
 ہو۔۔۔۔۔۔

جب گاڑی چلنے لگی، تو میں نے پہلی بار اس کے بالوں میں انگلیوں سے
 کنگھی کرتے ہوئے اس کی ہمت بندھائی۔ گریسی نے میرا دایاں ہاتھ اٹھا کر
 اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کی پلکوں میں دو گرم گرم آنسو مچلے، اور تڑپ کر
 میرے ہاتھ پر گر پڑے۔۔۔۔۔۔ دو جلتے ہوئے انگارے جو ازل تک اپنے
 خاموش داغ چھوڑ گئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ گریسی کے سپنوں کے خواب
 بھی اجڑ گئے، اس کے شبنم کے موتی بھی لٹ گئے، وہ جیتے جی مر بھی گئی۔۔۔۔۔۔
 لیکن اس کے دو غیر فانی موتیوں کو کون چھیڑ سکتا ہے، جو میرے دائیں ہاتھ
 کی رگ رگ میں پیوستہ ہیں؟

